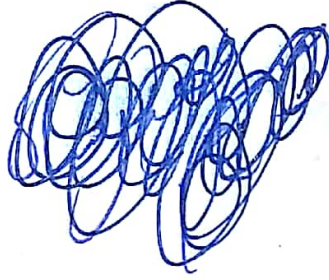




انشاء اور تلفظ



رشید حسن خاں

مکتبہ جامعہ ملیہ

اشتراک

پیشکش کی شہادت و فروغ اور زبان بانی

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کئی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلباء کے لیے ”درسی کتب“ اور ”معیاری سیریز“ کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کیا اب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعال ڈائریکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شامل حال رہے گا۔

خالد محمود

نیشنل ڈائریکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

© مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

Insha Aur Talaffuz

by

Rasheed Hasan Khan

Rs.45/-



صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ 110006

011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔ 400003

022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ 202002

0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سزاشاعت: 2011

تعداد: 1100

قیمت: -/45 روپے

ISBN: 978-81-7587-539-5

سلسلہ مطبوعات: 1445

ناشر: ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون 33-FC، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جولوہ، نئی دہلی۔ 110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طالع: ہے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار فیاض، جامع مسجد۔ 110006

اس کتاب کی چھاپائی میں TNPL Maphlitho 70 کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

مرزا ادیب کے نام

جن کا نام بچوں کے ادیب کی حیثیت سے بھی ہمیشہ
یاد رکھا جائے گا۔

رشید حسن خاں
۱۷ دسمبر ۱۹۹۳ء

حرفِ آغاز

املا پر تو پچھلے پندرہ بیس سال میں بہت سا کام ہوا ہے، مگر انشا پر اگر کچھ لکھا گیا ہے، تو اُسے نہ ہونے کے برابر سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک مشکل یہ ہے کہ اردو کے طالب علموں کے لیے ایسے ضروری موضوعات پر کچھ پڑھنے کی گنجائش کم سے کم ہوتی جاتی ہے۔ اس سے بھی بڑی مشکل یہ ہے کہ اس انداز کی توجہ بھی اس طرف گویا مبذول نہیں ہوتی۔ اس میں حالات کے جبر کا حصہ اتنا نہیں جتنا دخل ہماری بے اعتنائی کو ہے۔ طالب علم مجبور سہی، استاد اُس قدر مجبور نہیں ہوتا۔ وہ اگر املا اور انشا کے ضروری اجزاء کو اچھی طرح جانتا ہو، تو اپنے طلبہ کو بہ قدر ضرورت بتا سکتا ہے۔ یہ امکان ہمیشہ رہے گا کہ بہت سے طالب علموں میں سے چار چھ، یا دس بارہ ایسے طالب علم نکل آئیں جو ان موضوعات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس طرح زبان کے متعلقات کا شعور پیدا ہوتا رہے اور سلسلہ پوری طرح ٹوٹنے نہ پائے۔

لفظ کس طرح لکھا جائے، یہ املا کا مسئلہ ہے۔ جملہ کس طرح لکھا جائے، یہ انشا کا مسئلہ ہے۔ عبارت کی خوبیوں اور خامیوں کا تعلق بھی انشا سے ہوتا ہے۔ یوں انشا کی اہمیت کچھ کم نہیں۔ اس انداز اگر ان مسائل کو اچھی طرح جانتے ہوں تو پھر وہ مختلف موقعوں پر بعض نہایت ضروری باتوں کو اپنے طلبہ تک پہنچا سکتے ہیں۔

انشا وسیع موضوع ہے۔ اس مختصر کتاب میں اُس سے متعلق ساری معلومات کو یک جا کر دینا مقصود نہیں، اسی لیے ضروری باتوں کو اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

رشید حسن خاں

سکار ہال۔ دہلی یونیورسٹی، دہلی

انشا

جملہ، لفظوں سے بنتا ہے۔ جملوں سے عبارت بنتی ہے۔ اچھی عبارت کے لیے ضروری ہے کہ جملے بے عیب ہوں۔ بے عیب جملے ہم اُس وقت لکھ سکتے ہیں جب لفظوں کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ اچھی طرح جاننے کا مطلب یہ ہے کہ تین باتیں ضرور معلوم ہوں: ۱، لفظ کا صحیح املا کیا ہے۔ (۲) اُس کے معنی کیا ہیں۔ (۳) جملے میں اُس لفظ کو کس طرح لانا چاہیے۔ اُس تیسری بات میں قواعد، روزمرہ، محاورہ؛ یہ سب شامل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قواعد کی غلطی نہ ہو، اسی کے ساتھ ساتھ روزمرہ اور محاورہ بھی درست ہو۔

ذرا دیر کے لیے مان لیجیے کہ آپ نے یہ جملہ لکھا: اس دفعہ اُن کو سونے کا تمغہ ملا ہے۔ اس میں قواعد کے لحاظ سے کوئی عیب نہیں، اس کے باوجود یہ جملہ بے عیب نہیں۔ خرابی یہ ہے کہ ایک لفظ کا املا ٹھیک نہیں۔ اصل لفظ ”تمغہ“ ہے۔ املا کی اس ایک غلطی نے پورے جملے کو بگاڑ دیا۔

میں نے ایک بار ایک جملہ اس طرح لکھا تھا: سب عورتیں وہاں بیٹھیں ہوئیں تھیں۔ میرے استاد محترم نے سمجھا یا تھا کہ اس جملے میں فعل صحیح صورت میں نہیں آیا۔ یوں لکھنا چاہیے تھا: سب عورتیں وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ قواعد کی غلطی ہوئی۔

ہمارے ایک مشہور شاعر کا مصرع تھا: ”گٹھائیں چشم عنایت ادھر نہ فرمائیں“۔ مشہور نقاد نیاز فتح پوری نے اس پر یہ اعتراض کیا تھا کہ ”عنایت فرمانا، محاورہ ہے، چشم عنایت فرمانا، محاورہ نہیں۔ اس طرح معلوم ہوا کہ جملہ ہو یا مصرع، اس میں محاورے کو اصلی شکل میں آنا چاہیے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ محاوروں میں نہ تو کسی لفظ کو بدل سکتے ہیں، نہ کوئی لفظ کم کر سکتے ہیں، نہ بڑھا سکتے ہیں۔ شاعر نے اصل محاورے ”عنایت فرمانا، میں ایک لفظ ”چشم“ بڑھا دیا اور بات بگڑ گئی۔ اس مصرعے میں یہ زبان کا عیب ہوا۔

ایک پرانی بات یاد آگئی۔ بے تکلف دوستوں کی محفل جی ہوئی تھی، ایک صاحب نے کہا: باہر زور کی بارش پڑ رہی ہے۔ دوسرے صاحب نے تائید کی: ہاں بھائی، بہت زور کی بارش گر رہی ہے۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: بارش پڑنا اور بارش گرنا، دونوں روزمرہ کے خلاف ہیں۔ ”بارش ہونا، اور ”پانی برسنا، کہتے ہیں۔ وہ دونوں حضرات بھری محفل میں شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

روزمرہ کی تعریف تو آپ جانتے ہوں گے۔ اس کا مطلب ہے: اس طرح لکھنا یا بولنا، جس طرح معیاری اردو میں بولتے اور لکھتے آئے ہیں۔ مثلاً کوئی صاحب کہیں: ”آب پی لو“، تو کہا جائے گا کہ اردو والے اس طرح نہیں بولتے۔ ”پانی پی لو“ کہتے ہیں۔ ”آب“ کے معنی ہیں: پانی۔ لفظ اپنی جگہ ٹھیک ہے، بامعنی ہے، دوسرے مقامات پر استعمال میں بھی آتا ہے، لیکن ”پینے“ کے ساتھ ”پانی“ کا لفظ آتا ہے۔

یا جیسے یہ کہا جائے کہ ”اُن کا تو پانی دانہ اُٹھ گیا ہے“۔ اس پر بھی کہا جائے گا یہ روزمرہ کے خلاف ہے۔ روزمرہ کے لحاظ سے ”دانہ پانی“، کہنا چاہیے تھا، یعنی: اُن کا تو دانہ پانی اُٹھ گیا ہے۔ یا جیسے کوئی صاحب کہیں: ”آپ وہاں جاؤ گے کہا جائے گا کہ یہ مناسب انداز بیان نہیں“ آپ وہاں جائیے“ اور ”تم وہاں جاؤ“ کہتے ہیں۔ اردو کے مشہور شاعر فیض احمد فیض کی غزل کا

ایک شعر ہے:

خیر، ہیں اہل دیر جیسے ہیں آپ اہل حرم کی بات کرو
دوسرے مصرعے پر یہی اعتراض کیا گیا ہے کہ ”آپ بات کرو، صحیح انداز بیان نہیں“ آپ بات کیجیے، ”کہنا چاہیے، یا ”تم بات کرو، کہہ سکتے ہیں۔ اب ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ بے عیب تحریر وہ ہے جس میں روزمرہ اور محاورے کی غلطی نہ ہو، قواعد کی غلطی نہ ہو اور املا کی بھی غلطی نہ ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ بے عیب عبارت لکھنا اچھی بات ہے، لیکن یہی سب کچھ نہیں۔ اچھی عبارت وہ ہے جو بے عیب بھی ہو اور اس میں بیان کا حسن بھی ہو۔ ایک ہی بات کو کسی طرح کہا جاسکتا ہے، ذہین طالب علم اس بات کو جلد ہی سمجھ لیتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ اچھے سے اچھے انداز بیان کو اپنائیں۔ اس طرف توجہ کرنے سے اور شوق سے اچھی نثر لکھنے کا سلیقہ آتا ہے۔ مولانا حالی کا یہ مصرع ہمیشہ نظر کے سامنے رہنا چاہیے:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

اچھی نثر لکھنے کا کوئی مقررہ قاعدہ نہیں۔ سوچنے سمجھنے سے یہ بات اپنے آپ ذہن پر روشن ہونے لگتی ہے۔ کبھی ایسا کیجیے کہ ایک ہی جملے کو دو تین طرح لکھ کر دیکھیے۔ ایک دو بار لفظوں کی ترتیب بدل دیجیے، ایک دو لفظوں کو نکال دیجیے، یا ایک دو لفظوں کو بدل کر دیکھیے۔ آپ کو محسوس ہونے لگے گا کہ ایک ہی جملے کی ان کئی شکلوں میں سے کوئی ایک صورت ایسی بھی ہے جو دوسری صورتوں سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔

جملے میں جو لفظ لائے جائیں، تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ مطلب کو اچھی طرح ادا کر رہے ہیں، ایسا تو نہیں کہ ایک یا دو لفظ بدل دیے جائیں تو پہلے کے مقلبے میں مفہوم بہتر طور پر ادا ہو سکے گا۔ گویا اچھا جملہ لکھنے کے لیے مناسب لفظوں کا انتخاب پہلی ضروری بات ہے۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ جن مناسب لفظوں کو منتخب کیا جائے، جملے میں اُن کی ترتیب بھی مناسب طور پر ہو نا چاہیے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ کسی جملے میں کسی

ایک لفظ کو ادھر ادھر کر دینے سے بیان کا حسن بڑھ جاتا ہے، اور کبھی مفہوم کو ادا کرنے کی بہتر صورت سامنے آ جاتی ہے۔
یہ بات بھی دیکھنے کی ہوتی ہے کہ وہ جملہ جب زبان سے ادا ہوگا تو اس میں روانی کتنی ہوگی۔ کوئی ایسا لفظ تو نہیں آگیا ہے جس کو ادا کرنے میں زبان رکنے لگے۔ اچھی نثر کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں روانی ہوتی ہے، کھاؤ نہیں ہوتی۔ محض مثال کے طور پر اس جملے کو دیکھیے: ”تم یہاں سے کل کیا چلے گئے کہ گھر کی رونق ہی چلی گئی۔“ اس جملے کا مطلب تو روشن ہے، مگر بیان کا حسن نہیں آیا۔ جملے کے پہلے ٹکڑے ”کل کیا گئے کہ“ کو زبان سے ادا کرتے وقت روانی کی سانس تو ٹپتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اس علاوہ اس جملے میں جتنے لفظ آئے ہیں، ان سب کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ ان میں سے ایک دو لفظوں کو کم کیا جاسکتا ہے، مثلاً اس طرح: ”گھر کی رونق تمہارے ساتھ ہی چلی گئی تھی“ مطلب پورا کا پورا ادا ہو گیا اور اب اچھی طرح ادا ہوا کہ بیان کا حسن بھی شامل ہو گیا ہے۔
ہاں اس جملے کو یوں بھی لکھا جاسکتا تھا: ”گھر کی رونق تو تمہارے ساتھ ہی چلی گئی تھی“ مگر یہ بہتر صورت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ”تو تمہارے“ میں ت کے دوبار ایک ساتھ تلفظ میں آنے سے روانی کم ہو جاتی ہے۔ اس جملے کو ایک بار پڑھ کر دیکھیے، آپ خود محسوس کر لیں گے کہ ”تو تمہارے“ کو ادا کرتے وقت زبان میں لگنت سی آ جاتی ہے۔ یہ خوبی نہیں، خامی ہے۔ ”کل کیا گئے کہ“ میں بھی یہی خامی تھی۔
کسی اچھے جملے کو دو تین بار پڑھیے، آپ محسوس کریں گے کہ ایک خاص طرح کا آہنگ اور ایک خاص طرح کی نغمگی اس کے اندر موجود ہے۔ جملے میں جتنی روانی ہوگی، اُسی نسبت سے اس میں وزن اور آہنگ کی لہریں پیدا ہوں گی۔
روانی ٹوٹنے لگے گی، تو وہ آہنگ بھی ٹوٹنے لگے گا۔

شاعری میں تو اس پہلو پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ ایک ہی مثال سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ مولانا شبلی نے

میر انیس کی شاعرانہ خوبیوں پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ دو مصرعے لکھے ہیں۔ ان دونوں مصرعوں میں ایک ہی بات کہی گئی ہے۔ ایک مصرع یہ ہے: ”تھا بلبیل حق کو کہ چمکنا تھا چمن میں“ اسی بات کو دوسرے مصرعے میں اس طرح کہا گیا ہے: ”بلبل چمک رہا تھا ریاض رسول میں“ آپ نے دیکھا پہلے مصرعے میں روانی کی کمی ہے۔ لفظوں کے غیر مناسب انتخاب سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے۔ خاص کر ”گو کہ“ اسے روانی بے طرح ٹوٹ گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا مصرع کیسا رواں ہے! پڑھ کر دیکھیے، زبان کہیں نہیں رکے گی۔ اسی خوبی نے اس مصرعے کو پہلے مصرعے سے بہتر بنا دیا ہے۔ اس سلسلے کی کچھ اور باتیں ذرا آگے چل کر بیان کی جائیں گی۔



جملے دو طرح کے ہوتے ہیں: مفرد، مرکب۔ ”مرکب جملے“ وہ ہوتے ہیں جو دو یا زیادہ مفرد جملوں سے مل کر بنے ہوں۔ مثلاً اس جملے کو دیکھیے: ”وہ کل یہاں سے گئے تھے، لیکن آج پھر واپس آگئے اور آتے ہی جرم کر بیٹھ گئے، مگر ان کے آتے ہی کچھ دوسرے لوگ بھی آگئے اور وہ لوگ بھی ان سے باتیں کرنے لگے، یوں سارا دن گزر گیا۔“

اس طویل جملے میں پانچ چھوٹے چھوٹے جملے شامل ہیں۔ لمبے مفرد جملے لکھنا یا طویل مرکب جملے لکھنا غلط نہیں۔ بہت سے مقامات پر ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ مختصر جملوں میں اگر مفہوم آسانی کے ساتھ ادا ہو سکتا ہو، تو پھر طویل جملے لکھنے کی ضرورت نہیں، اسے غیر مناسب کہا جائے گا۔ مثال کے طور پر اوپر والے طویل جملے کو دیکھیے۔ اس میں سے ”لیکن“، ”اور“، ”مگر“ یہ تین لفظ کم کر دیے جائیں، تو یہ ضرورت سے زیادہ لمبا جملہ، چھوٹے چھوٹے جملوں میں تقسیم ہو جائے گا: وہ کل ہی تو گئے تھے، آج واپس آگئے۔ آتے ہی جرم کر بیٹھ گئے۔ ان کے آتے ہی کچھ اور لوگ بھی آگئے۔ یہ لوگ بھی ان سے باتیں کرتے رہے۔ یوں سارا

دن گزر گیا۔

بیسے بیسے جملوں میں کبھی یہ خرابی پیدا ہو جاتی ہے کہ زائد لفظ شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ مفہوم کی تکرار ہو جاتی ہے کہ ایک ہی بات کو بار بار کہا جاتا ہے۔ عبارت میں زائد یعنی فالتو لفظ ہوں، اسے عیب کہا جائے گا۔ اسی طرح مفہوم کی تکرار ہو، تو اسے بھی خرابی مانا جائے گا۔ نئے نئے لکھنے والوں کو شروع میں اس کا اچھی طرح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ جب مشتق ہو جائے اور لکھنا آجائے، تب ضرورت کے مطابق ہر طرح کے جملے لکھے جاسکتے ہیں بشرط میں مفرد جملے کو مرکب جملے پر ترجیح دینا چاہیے۔ یہ بھی کوشش کرنا چاہیے کہ جملے ضرورت سے زیادہ طویل نہ ہوں۔

ایک مثال سے اس کی وضاحت اچھی طرح ہو سکے گی۔ ایک تنقیدی مضمون میں لکھے گئے اس جملے کو دیکھیے:

”مرزا عبد القادر بیدل، مرزا غالب اور مرزا یاس بیکانہ چنگیزی کی روایاتِ فکر و فن کے امین، کلاسیکی زبان و ادب سے استناد و واقفیت اور اپنے وسیلہ اظہار پر مکمل دسترس رکھنے والے، تجزیہ و تفتیش کے مراحل سے گزر کر اپنے پیرایہ بیان کو زیادہ سے زیادہ شخصی، انفرادی اور مکمل بنانے والے، زمان و مکان کے مسائل کو عشق و وجدان کے تناظر میں قلم بند کرنے والے شاعر نے اردو غزل میں کیسے کیسے گراں قدر اشعار کا اضافہ کیا ہے، جن کی کیفیت سدا بہار ہے، جن کی لطافت و اثر آفرینی قائم و دائم ہے۔“

یہ ایک جملہ ہے۔ جملہ کیا ہے، شیطان کی آنت ہے۔ اس سے لکھنے والے کا انٹری پن ظاہر ہوتا ہے۔ شروع میں مشتق کم ہوتی ہے اور معلومات زیادہ نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ مختصر اور مفرد جملے لکھنے پر زور دیا جاتا ہے۔ ابتدا میں اچھی عبارت لکھنا آجائے، تو پھر یہ خوبی قلم کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ شروع میں اس طرف توجہ نہ کی جائے، تو پھر زندگی بھر اس خرابی کو بھرنہ جھکنا

پڑتا ہے۔ اوپر جس طویل جملے کو نقل کیا گیا، وہ اس کا مثبت ہوتا ثبوت ہے۔ کبھی خواجہ حسن نظامی کا کوئی مضمون مل جائے، تو اسے دل لگا کر اور نظر کا کر پڑھیے گا۔ آپ دیکھیں گے زیادہ تر مختصر جملے ہیں۔ بیان میں سادگی اور صفائی ہے۔ عربی فارسی کے مشکل لفظ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں نے عبارت کو چست بنا دیا ہے۔ فالتو لفظوں کا پتا نشان نہیں ملے گا۔ عبارت اس صفائی کے ساتھ مطلب کو ادا کر رہی ہے جیسے نظر شیشے کے پار ہو جاتی ہے۔ طراقت سے بھری ہوئی روانی ایسی ہے جیسے جھرنابہ رہا ہو۔ اچھی تشریں یہی خوبیاں ہوتی ہیں۔

عربی اور فارسی سے اردو نے بہت فیض پایا ہے۔ ان زبانوں کے بہت سے لفظ اردو میں شامل ہیں۔ یہ لفظ ہماری زبان میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ غیریت باقی نہیں رہی۔ ان دونوں زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندی اور بعض دوسری ہندوستانی زبانوں کے لفظ بھی ہماری زبان میں موجود ہیں۔ پچھلے دو سو برسوں میں انگریزی کے بہت سے لفظ اردو میں شامل ہو گئے ہیں۔ ہاں، یہ خیال رہے کہ عربی اور فارسی کے مقابلے میں، دوسری زبانوں کے لفظوں کی تعداد زیادہ ہے۔ فعل تو سب ہندی سے آئے ہیں (البتہ اردو نے ان کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے)۔

محاورے اور کہاوتیں دھڑلے (التمثال) ایسے کہنے ہوئے ہیں جن میں اس ملک کی تہذیب کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ محاورے عام طور پر ہماری مشترکہ تہذیب کے عکس دکھاتے ہیں۔ اسی طرح کہاوتوں میں ہماری زندگی کی چھوٹی چھوٹی تصویریں نظر آتی ہیں۔ محاوروں اور کہاوتوں میں عربی، فارسی الفاظ کی تعداد کم سے کم ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اردو ایک ملی جلی زبان ہے۔ اس میں عربی، ہندی کے لفظ اچھی خاصی تعداد میں ہیں، لیکن دوسری زبانوں کے لفظوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مختلف زبانوں کے لفظ مل جل کر ایک ہی زبان کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ اب ہم ان سب لفظوں کو اردو کے لفظ

مانتے ہیں۔ اس کو یوں بھی دیکھیے کہ ایسے اکثر لفظوں کا اطلاق نہیں بدلا، لیکن تلفظ بہت سے لفظوں کا بدل گیا۔ عربی، فارسی کے لفظوں کو ہم ان زبانوں کے تلفظ کے مطابق زبان سے ادا نہیں کرتے، کر بھی نہیں سکتے۔ اردو والوں کا جو تلفظ ہے، اس کے مطابق سبھی لفظ استعمال میں آتے ہیں۔ کوئی کہے بھی کہ عربی میں تو اس لفظ کا تلفظ یہ ہے، تو ہم کہتے ہیں کہ ہاں، جب عربی بولیں گے تو یہی تلفظ اختیار کر لیں گے۔

کچھ وقت ہم یہ نہیں دیکھتے کہ عبارت میں جو لفظ آئے ہیں، وہ اصل کس زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیکھنا بھی نہیں چاہیے۔ ہاں، ہم ایک پہلو پر ضرور نظر رکھتے ہیں کہ ممکن حد تک مشکل لفظ ہماری عبارت میں نہ آنے پائیں۔ مفہوم کو ادا کرنے کے لیے آسان لفظ موجود ہیں، تو پھر مشکل لفظوں کو عبارت میں نہیں ٹھونسن چاہیے۔ اس ٹھونسن ٹھانسن سے عبارت بے لطف ہو جاتی ہے، بندش کی جتنی باقی نہیں رہتی اور روانی ختم ہو جاتی ہے۔ چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا اسی کو کہتے ہیں۔ پڑھتے وقت لغت کی کتاب سامنے رکھنا ضروری ہو، تو وہ نشر کیا ہوئی ایہ تو بے کمالی بلکہ بے ہنری کی پہچان ہے۔

مثال کے طور پر اس مختصر سی عبارت کو دیکھیے: ”مجھے جب بھی اشتہار ہوتی تھی، میں فواکھات سے شکم پُری کر لیا کرتا تھا۔ اسی طرح وہ شش ماہہ مدت گزر گئی اور یوم رہائی آگیا۔“ کس قدر بے ہنگم عبارت ہے! مشکل لفظوں کے پتھر بچھا دیے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کھنے والے کو خوش مذاقی چھو بھی نہیں گئی۔ اس عبارت کو اس طرح بھی کھا جاسکتا تھا: ”مجھے جب بھی بھوک لگتی تھی، بھلوں سے پیٹ بھر لیا کرتا تھا۔ اسی طرح وہ چھ مہینے گزر گئے اور رہائی کا دن آگیا۔“

لفظوں کے انتخاب میں خاص طور پر اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ مثال کے طور پر ”حتی الامکان“ کی جگہ ”امکان بہرہ اور“ علی الصبح“

کے بجائے ”صبح تڑکے“ کہہ سکتے ہیں۔ یا جیسے: ”یہ امر میرے لیے باعث مسرت ہوگا“ اس کی جگہ سادہ سا جملہ کھا جاسکتا تھا، مثلاً: ”اس سے مجھے مسرت حاصل ہوگی۔ یا ایسا ہی کوئی اور جملہ“ امر“ اور ”باعث“ جیسے مشکل لفظ کھینے کی کیا ضرورت ہے، جب کہ ان کے ہم معنی آسان لفظ موجود ہیں۔

ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جس طرح عربی فارسی لفظوں سے خواہ مخواہ بچنا غیر مناسب ہے، اسی طرح بے ضرورت ان کو عبارت میں شامل کرنا بھی مناسب نہیں۔ لفظوں کے انتخاب میں بس یہ پہلو سامنے رہنا چاہیے کہ مطلب صحیح طور پر ادا ہو جائے اور ممکن حد تک عبارت میں سادگی رہے۔ اس کے بجائے، اگر علم کی نمائش مقصود ہو، تو اس کو بدذوقی اور نامعقولیت کہا جائے گا۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ کھینے والا ناڑی ہے۔



دو طالب علم باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا: ”مارنگ میں ایک فریڈ کے گھر گیا تھا۔ پھر فادر کے ساتھ شاپنگ کرنے نکل گیا۔ آفٹرون میں پلے گراؤنڈ پر گیا۔ وہاں ٹی بریک کے بعد کھیل کی بکننگ بس ہوئی تھی۔“ آپ نے ضرور محسوس کر لیا ہوگا کہ ان صاحب کی گفتگو میں انگریزی کے لفظ غیر ضروری طور پر استعمال میں آئے ہیں۔ انگریزی کے بہت سے لفظ ہماری زبان میں شامل ہو چکے ہیں اور وہ زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔ یہ ایسے لفظ ہیں جن کا بدل ہمارے پاس موجود نہیں۔ جیسے: اسٹیشن، اسکول، میزائل، تھرما میٹر، اڈیٹر، آکسیجن، ہانڈ روجن، ناول، فلم، ٹیلی ویژن، ریفریجریٹر، لاؤڈ اسپیکر، ٹیلی ویژن، لیڈم۔ غرض کہ ایسے بہت سے لفظ ہیں۔ اب یہ سب لفظ اردو کے اپنے لفظ ہیں۔ اگر کوئی شخص ٹیڈ لائٹ اسپیکر کی جگہ ”آئڈ لائٹ اسپیکر“ استعمال کرے یا جیسے تھرما میٹر کی جگہ ”مقیاس حرارت“ کہے، تو سمجھا جائے گا کہ یہ شخص زبان کو مشکل اور بوجھل بنانا

انشا اور تلفظ

۱۴

چاہتا ہے، اس کو اچھا نہیں سمجھا جائے گا۔ اسی طرح جن لفظوں کے بدل ہمارے پاس پہلے سے موجود ہیں، اُن کی جگہ انگریزی لفظ لانا بے نیکی کی بات ہے۔ اس سے گفتگو اور تحریر، دونوں کا رنگ بگڑ جائے گا۔ اوپر جس گفتگو کا حوالہ دیا گیا ہے، اُس کا بھی یہی احوال ہے۔ اسے بگڑی ہوئی اردو کہا جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں انگریزی کے جتنے لفظ آئے ہیں، وہ سب غیر ضروری طور پر بھرے گئے ہیں۔ آسانی کے ساتھ یہ کہا جاسکتا تھا کہ میں صبح کے وقت ایک دوست کے گھر گیا تھا۔ پھر والد صاحب کے ساتھ کچھ خریدنے کے لیے بازار چلا گیا۔ سہ پہر کو کھیل کے میدان میں پہنچا، وہاں چاہے کے وقفے کے بعد کاکھیل بس شروع ہوا تھا۔

ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر نے دسمبر - فروری ۱۹۹۲ء کے شمارے میں لکھا ہے: ”ساہتیہ اکادمی جیسے معتبر ادارے کے اعلان سے بہت پہلے انعام پانے والے کا نام مہندہ انداز میں سرکولیشن میں آتا رہا ہے۔“ سرکولیشن میں آتا رہا ہے، بے جوڑ ٹکڑا ہے۔ یہاں انگریزی کا ایک لفظ غیر ضروری طور پر شامل عبارت ہو گیا ہے۔ اس کی جگہ عام فہم اردو لفظ بہ آسانی لایا جاسکتا تھا۔ ایسی بے جوڑ پیوند کاری عبارت کو خراب کر دیا کرتی ہے۔ پڑنے والے لوگ ایسی زبان کو ”گورا شاہی“ اردو، کہا کرتے تھے۔ ایسی گفتگو یا تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص بد ذوق بھی ہے اور مناسب و غیر مناسب لفظوں کے انتخاب اور استعمال میں جو فرق ہوتا ہے، اُس سے بھی واقف نہیں۔



عبارت کی خرابی میں زائد لفظوں کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔ زائد لفظوں سے مراد ہیں ایسے لفظ جن کو اگر نکال دیا جائے، تو مفہوم پر اثر نہ پڑے اور عبارت پہلے سے بہتر ہو جائے۔ پنڈت ہری چند اختر اپنے زمانے کے مشہور شاعر اور ادیب تھے۔ انھوں نے ایک بار ایک نئے کھنڈے والے سے کہا تھا: یہ تو بہتوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کیا کھنا ہے، لیکن یہ بات کم لوگوں

انشا اور تلفظ

۱۵

کو معلوم ہوتی ہے کہ کیا نہیں کھنا ہے۔ کیسی اچھی بات کہی تھی! ایک مشہور محترمہ ساز سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ اس قدر خوب صورت محبت کیے بنا لیتے ہیں۔ اُس نے جواب دیا: میں پنچر کی ریل میں سے فالتو حقے نکال دیتا ہوں۔ ہا کمال استاد نے ایک جملے میں پوری بات کہہ دی اور بات بھی کیسی، جس کی تشریح کی جائے تو کوئی صفحے نکلے جاسکتے ہیں۔

○ اِس جملے کو دیکھیے: چون کہ وہ بیمار تھے، اِس لیے میں اُن کو دیکھنے کے لیے گیا تھا۔ اب اِس جملے کو اِس طرح کھڑک دیکھیے: وہ بیمار تھے، اِس لیے میں اُن کو دیکھنے گیا تھا۔ مفہوم وہی رہا، اُس میں ذرا سی بھی کمی نہیں ہوئی۔ چون کہ ”اور“ کے لیے، ”کے نکل جانے سے جملہ بہتر ہو گیا۔“

○ ایک اور جملہ: وہ اگرچہ مصروف نہیں تھے، مگر وہ میرے پاس نہیں بیٹھے۔ اِس کو اِس طرح کھڑک دیکھیے: وہ مصروف نہیں تھے، مگر میرے پاس نہیں بیٹھے۔ جملے کے شروع میں ”اگرچہ“ زائد ہے۔ اسی طرح ”وہ“ کی تکرار بھی غیر ضروری ہے۔ دو زائد لفظ نکل گئے تو جملہ بہتر ہو گیا۔

○ ”ہم نے سارا سامان تیار کر لیا تھا، مگر اِس کے باوجود انھوں نے یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کیا، شام ہی کو چلے گئے۔“

دوسرے جملے کے شروع میں ”مگر اِس کے باوجود“ آیا ہے۔ اِس میں سے ”مگر“ کو نکال دیجیے اور یوں کھڑک دیکھیے: ہم نے سارا سامان تیار کر لیا تھا، اِس کے باوجود انھوں نے..... اب اِسی کو یوں دیکھیے: ہم نے سارا سامان تیار کر لیا تھا، مگر انھوں نے یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کیا۔ دونوں صورتوں میں عبارت ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ”مگر“ اور ”اِس کے باوجود“ میں سے ایک ٹکڑا زائد ہے۔

○ ”وہاں ایسی کوئی جگہ موجود نہیں کہ جہاں مسافر کسی سایہ دار درخت کی چھاؤ میں بیٹھ سکے۔“ اِسی مرتب جملے کو اِس طرح کھڑک دیکھیے: وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں مسافر کسی سایہ دار درخت... بات بھی مکمل ہو گئی اور بیان کے لحاظ سے عبارت بھی بہتر ہو گئی۔ اب

معلوم ہوا کہ پہلے جملے میں ”کہ“ اور ”موجود نہیں“ دو ٹکڑے زائد تھے۔ ان سے اصل مفہوم میں کسی طرح کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ ان کے نکال دینے سے اصل مفہوم میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ بیان کے لحاظ سے یہ جملہ پہلے جملے کے مقابلے میں بہتر ہو گیا۔

”سایہ دار درخت کی چھاؤں“ سے مجھے اردو کے مشہور شاعر حفیظ جون پوری کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ گیا:

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤ گھنی ہوتی ہے

ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

کیسی سچی بات کہی ہے اور کیسے اچھے ڈھنگ سے کہی ہے۔

○ ————— ”ممود وہاں گئے تو ہیں، لیکن دیکھیے کیا ہوتا ہے۔“ قواعد کے مطابق اس جملے میں کوئی عیب نہیں۔ اچھا اب اسے اس طرح لکھ کر دیکھیے: ”ممود وہاں گئے تو ہیں، دیکھیے کیا ہوتا ہے۔“ مفہوم میں کمی نہیں ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے جملوں میں ”لیکن“ نہ لکھا جائے تب بھی جملہ ہر لحاظ سے مکمل رہے گا۔

مگر، لیکن، اگر، چونکہ، کہ، اگرچہ، یہ سب کام کے لفظ ہیں۔ مرکب جملوں میں ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ بعض دفعہ ان کے بغیر مرکب جملے میں ربط پیدا نہیں ہو پاتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی ان کے بغیر جملہ مکمل ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ان کو شامل کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں پہلو دیکھنے والے کی نظر میں رہیں۔

○ ————— ”یہ مانا کہ آپ وہاں نہیں جائیں گے“ اس جملے میں قواعد کے لحاظ سے کوئی عیب نہیں، اس کے باوجود اس میں سے ”کہ“ نکال سکتا ہے: ”یہ مانا آپ وہاں نہیں جائیں گے۔“ بات مکمل ہے، کسی طرح کی کمی پیدا نہیں ہوئی، البتہ بیان کی خوبی کچھ بڑھ گئی۔

○ ————— ”غریبیکہ وہ سب لوگ دوبارہ وہیں چلے گئے۔“ ”غریبیکہ“ لکھنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ ”غرض کہ“ کافی ہے۔ اس کی جگہ ”الغرض“

بھی لکھا جاتا ہے، مگر اس میں عربی پن زیادہ ہے۔ ”غرض کہ“ مناسب نکتہ ہے۔

○ ————— اسی انداز کا ایک مرکب لفظ ”گویا کہ“ ہے۔ لوگ لکھتے ہیں ”مرف“ ”گویا“ لکھا جائے، تب بھی مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے گا اور قواعد کے لحاظ سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔

○ ————— ”یعنی کہ“، ”بھی کبھی دیکھنے اور سننے میں ابھایا کرتا ہے۔“ اس میں ”کہ“، ”زائد ہے“، ”یعنی“ کافی ہے۔

○ ————— ایک مشہور لکھنے والے نے لکھا تھا: ”حال آنکہ انھیں شائع ہونے ڈیرٹھ صدی سے زیادہ کا زمانہ گزر چکا ہے۔“ ”زیادہ کا زمانہ“ میں ”کا“، ”زائد ہے“ ڈیرٹھ صدی سے زیادہ کا زمانہ گزر چکا ہے، ”لکھا بہتر ہوتا۔

○ ————— ”اب تم کدھر کو جاؤ گے۔“ پہلی ہی نظر میں معلوم ہو سکتا ہے کہ ”کدھر کو“ میں ”کو“ زائد ہے۔ ”اب تم کدھر جاؤ گے“ بہتر انداز بیان ہوگا۔

○ ————— ”وہ اُدھر کو گئے ہیں۔“ اس میں بھی ”کو“ زائد ہے۔ وہ اُدھر گئے ہیں، ”لکھنا مناسب ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کر دی جائے۔ اُدھر کو، اُدھر کو، جُدھر کو، کدھر کو استعمال میں آئے ہیں، شاعروں کے یہاں خاص طور پر۔ مثلاً مولانا حالی کا مشہور مصرع ہے: ”چلو تم اُدھر کو، ہوا ہو جُدھر کی۔“ اس بنا پر ہم ان لفظوں کو غلط نہیں کہیں گے، البتہ یہ ضرور کہیں گے کہ شاعروں کی ہر وی نہیں کرنا چاہیے۔ شاعروں کو تو بہت سی آزادیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ہم ان پر اعتراض نہیں کریں گے، لیکن جب ہم نثر لکھیں گے تو خیالی رکھیں گے کہ زائد لفظ جملے میں نہ آنے پائیں۔ اس وجہ سے ہم ”اُدھر کو“، ”پہن لکھیں گے“، ”مرف“ ”اُدھر“ لکھیں گے۔ اسی طرح جُدھر اور کدھر۔

○ ————— ”اگرچہ“، ”مصحح لفظ ہے“، استعمال میں آتا ہے۔ بعض لوگ ”غضب“ کرتے ہیں کہ ”اگرچہ کہ“ لکھتے ہیں۔ ”اگرچہ“ کافی ہے۔ ”کہ“ بے ضرورت ہے، اس کی گنجائش ہی نہیں۔

ہاں ”بہ شرطیہ کے“ ٹھیک ہے، اسے بلا تکلف لکھا جاسکتا ہے۔ لکھا بھی جاتا ہے۔ بہ ضروری ہے کہ اس میں فارسی پن نمایاں ہے۔ آپ اگر اپنی نثر میں اس کی جگہ ”شرطیہ ہے“ لکھیں تو بہتر ہوگا۔ شروع میں بھاری بھر کم لفظوں سے ممکن حد تک بچنا چاہیے؛ مثلاً: میں آجاؤں گا، شرط یہ ہے کہ آپ بھی صبح وقت پر آنے کا وعدہ کریں۔

○ — ”اُنھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم نہیں آؤ گے، تو بنایا کام بگڑ جائے گا“۔ اس جملے میں دو لفظ ”کہ اگر“ ایک ساتھ آئے ہیں۔ ان کا ساتھ ساتھ آنا قواعد کے لحاظ سے غلط نہیں؛ لیکن ایسے اکثر جملوں میں محسوس یہی ہوتا ہے کہ اچھا ہوتا اگر یہ دونوں اس طرح ایک ساتھ نہ آتے۔ حسن بیان کے لحاظ سے مناسب یہی ہوگا کہ ”اگر“ اور ”کہ“ ساتھ ساتھ نہ آئیں۔ مثلاً اس جملے کو یوں بھی لکھا جاسکتا ہے: اُنھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تم اگر نہیں آؤ گے۔۔۔۔۔ ایک لفظ کے بیچ میں آجانے سے بیان پہلے سے بہتر ہو گیا۔

اب اس جملے کو دیکھیے: ”وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس دفعہ فیل ہو گیا تو بہت رُسوائی ہوگی“۔ یہاں بھی وہی بات ہے۔ اسے یوں لکھا جاسکتا ہے: وہ سوچ رہا تھا کہ اس بار بھی اگر فیل ہو گیا تو۔۔۔۔۔

اب ایک اور بات: اس جملے میں ”اگر“ نہ لکھیں تب بھی کوئی کمی نہیں محسوس ہوگی، یعنی: وہ سوچ رہا تھا کہ اس دفعہ بھی فیل ہو گیا تو بہت رُسوائی ہوگی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسے جملے بھی ہوتے ہیں جن میں ”کہ“ کے ساتھ یا جملے میں کسی اور جگہ ”اگر“ لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بہتر یہی ہوگا کہ ایسے جملوں میں ”اگر“ نہ لکھا جائے۔

آپ ان دونوں جملوں کو ایک بار نظر جمائیں۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ پہلے جملے کا انداز کچھ ایسا ہے کہ اس میں ”اگر“ سے بیان میں زور بڑھ جاتا ہے،

یوں اس جملے میں ”اگر“ لکھنا ضروری ہے۔ اس کے برخلاف، دوسرا جملہ ایسا ہے کہ اس میں سے ”اگر“ کو یہ آسانی کم کیا جاسکتا ہے۔ اداے مطلب پر ذرا بھی اثر نہیں پڑے گا، البتہ بیان کا حسن بڑھ جائے گا۔ ایسے جملے لکھتے وقت اس پہلو پر بھی نظر رکھنا چاہیے۔

○ — ایک صاحب نے حظ میں لکھا تھا: ”آپ نے پھر تقاضہ کیا اور دھمکی بھی دی ہے، دریاں حالیکہ میں پچھلے ہفتے آپ سے کہ چکا ہوں کہ بہت جلد وہ رقم آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔“

اس عبارت میں ”دریاں حالیکہ“ کس قدر بھاری بھر کم لفظ ہے اس کی جگہ ”حالانکہ“ لکھا جاسکتا تھا۔ دریاں حالیکہ، اور ”غرضیکہ“، ایک ہی انداز کے لفظ ہیں۔ ان کی جگہ ”غرض کہ“ اور ”حالانکہ“ لکھنا چاہیے۔ اوپر جو عبارت نقل کی گئی، اس میں ایک غلطی املا کی ہے ”تقاضہ“ لکھا گیا ہے، لیکن اس لفظ کا صحیح املا ”تقاضا“ ہے۔ ایسے کئی لفظ ہیں جن کے آخر میں الف ہے، مگر غلطی سے ان کے آخر میں کھ دی جاتی ہے۔ ان کا مفصل بیان املا کے حصے میں ملے گا۔

○ — لفظوں کی غیر ضروری تکرار بڑا عجیب ہے، اس سے بچنا چاہیے۔ مثال کے طور پر اس جملے کو دیکھیے: ”میں نے کہا ضرور تھا کہ میں تمھارے ساتھ چلوں گا، لیکن میں کیا کرتا، مجھے فرصت ہی نہیں ملی۔“

اسے اس طرح لکھ کر دیکھیے: میں نے کہا ضرور تھا کہ تمھارے ساتھ چلوں گا، لیکن کیا کرتا، فرصت ہی نہیں ملی۔ دو جگہ ”میں“ اور ایک جگہ ”مجھے“، یہ تینوں لفظ غیر ضروری ہیں، یعنی زائد ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ ایسے زائد لفظ عبارت کے حسن کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اچھی عبارت وہ ہے جس میں لفظی کفایت شعاری سے کام لیا گیا ہو۔ زائد لفظ نہ ہوں، غیر ضروری طور پر لفظوں کی تکرار نہ ہو اور ممکن حد تک ایسے لفظ نہ ہوں جنہیں عربی فارسی کے بھاری بھر کم لفظ کہا جاسکے۔ نیز غیر ضروری انگریزی لفظوں کے بے جوڑ پیوند نہ لگائے گئے ہوں۔



○ ————— ”تم کبھی بھی اس کام کو مکمل نہیں کر سکو گے“ اس جملے میں کوئی خرابی ہے ؟ غور سے دیکھیے۔ اچھا اسی جملے کو اس طرح لکھ کر دیکھیے : ”تم کبھی بھی اس کام کو مکمل نہیں کر سکو گے۔ بات پوری ہو گئی نا ! معلوم یہ ہوا کہ ”کبھی بھی“ کی جگہ ”کبھی“ لکھنا کافی تھا، ”بھی“ زائد ہے۔ اصل مفہوم سے اس لفظ کا کچھ تعلق نہیں اس کے علاوہ ”کبھی بھی“ بولنے میں کتنا برا لگتا ہے !

○ ————— ”تم ابھی بھی نہیں سمجھ پائے کہ اُن کا ارادہ کیا ہے؟“ اس جملے میں ”ابھی بھی“ کی جگہ ”اب بھی“ لکھ کر دیکھیے یا آپ محسوس کریں گے کہ اندازِ بیان کے لحاظ سے جملہ بہتر ہو گیا ہے۔ ”کبھی بھی“ کی طرح ”ابھی بھی“ کو بھی عبارت میں شامل نہ ہونے دیجیے۔ تلفظ کے لحاظ سے ”ابھی بھی“ کے مقابلے میں ”اب بھی“ سبک اور رواں ہے۔

○ ————— ”اس کے باوجود بھی تم اُن کی تعریف کر رہے ہو“ ”بھی“ یہاں بھی زائد ہے۔ ”اس کے باوجود تم اُن کی تعریف کر رہے ہو“ لکھنا چاہیے تھا۔ یاد رکھیے کہ ”اس کے باوجود“ کے بعد ”بھی“ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

○ ————— ایک صاحب نے لکھا تھا : ”اس کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں وہاں تھیں“۔ اس جملے میں ”اس کے علاوہ بھی“ کس قدر بھلا معلوم ہوتا ہے ! ”اس کے علاوہ اور بہت سی چیزیں وہاں تھیں“ لکھا جاسکتا تھا۔ یوں بھی لکھ سکتے تھے : ”اس کے علاوہ اور بھی چیزیں وہاں تھیں“ مطلب یہ ہے کہ ”بھی“ اور ”اس کے علاوہ“ کو ایک ساتھ نہیں لانا چاہیے۔



○ ”صرف“ اور ”ہی“ ایسے لفظ ہیں جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔

ذرا دیر کے لیے مان لیجیے کہ جملہ اس طرح لکھا گیا : ”صرف میں ہی اس کام کو انجام دے سکتا ہوں“۔ اس میں ”صرف“ اور ”ہی“ میں سے ایک لفظ زائد ہے۔ اس جملے کو یوں لکھ کر دیکھیے : ”میں ہی اس کام کو انجام دے سکتا ہوں“۔ بات مکمل ہو گئی نا ! یا مثلاً یہ جملہ : ”صرف نئی تعلیم ہی سماجی شعور پیدا کر سکتی ہے“ اس جملے کو اُکریوں لکھا جاتا : ”صرف نئی تعلیم سماجی شعور پیدا کر سکتی ہے“ تب بھی بات مکمل ہو جاتی اور تکرار کا عیب پیدا نہ ہوتا۔ ”صرف میں ہی“ لکھنا ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے سٹائٹ سوپ صابن، یا شب قدر کی رات۔

○ ”صرف“ اور ”ہی“ ان کو ایک ساتھ نہ لائیے۔ یا تو ”صرف“ لکھیے یا ”ہی“ لکھیے۔ اکثر صورتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ”ہی“ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ جملہ : ”اب تو صرف خدا مدد کر سکتا ہے“ اسے اگر اس طرح لکھا جائے : ”اب تو خدا ہی مدد کر سکتا ہے“ تو صاف طور پر محسوس ہوگا کہ حسنِ بیان اور زورِ بیان، دونوں کے لحاظ سے جملہ بہتر اور پُر زور ہو گیا ہے۔

○ ————— ”فقط میں ہی نہیں گیا“۔ اس جملے میں بھی وہی عیب ہے۔ ”فقط“ اور ”ہی“ ایک ہی مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔ ”میں ہی نہیں گیا“ لکھنا کافی تھا۔ جس طرح ”صرف“ کے ساتھ ”ہی“ کو جمع نہیں کرنا چاہیے، اُسی طرح ”فقط“ اور ”ہی“ کو بھی ایک ساتھ نہیں لانا چاہیے۔

○ ————— ایک صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا تھا : ”یہ تبدیلیاں صرف بمبئی ہی تک محدود نہیں تھیں“۔ اس جملے میں ”صرف“ اور ”ہی“ میں سے ایک لفظ زائد ہے۔ اس سے مفہوم میں کچھ اضافہ نہیں ہوا، البتہ بیان کا حسن کم ہو گیا، بلکہ یوں سمجھیے کہ بگڑ گیا۔ ”یہ تبدیلیاں بمبئی تک محدود نہیں تھیں“ لکھا جاسکتا تھا۔

○ ————— ”نہ تم وہاں گئے، نہ ہی وہ یہاں آئے“ ”نہ تم بات مانتے ہو، نہ ہی وہ اس طرف توجہ کرتے ہیں“۔ دونوں جملوں میں ”ہی“

زائد ہے۔ اس سے جملوں میں بھڑپن پیدا ہو گیا ہے۔ ”نہ ہی“ کے بجائے صرف ”نہ“، لکھنا چاہیے تھا: نہ تم وہاں گئے، نہ وہ یہاں آئے۔ نہ تم بات سننے ہو، نہ وہ اس طرف توجہ کرتے ہیں۔

○ اس جملے کو دیکھو: ”یہ صرف دہلی ہی سے مخصوص نہیں ہے۔“ اس ایک جملے میں صرف، ہی، مخصوص؛ یہ تین لفظ ایسے ہیں جو ایک ہی مفہوم کو ادا کر رہے ہیں۔ اگر اسے یوں لکھا جاتا: ”یہ دہلی سے مخصوص نہیں،“ تو دو زائد لفظ عبارت میں شامل نہ ہو پاتے۔ اس کے ساتھ ساتھ ”نہیں ہے“ میں سے بھی ایک لفظ کم ہو جاتا۔ مفہوم اور حسن بیان، دونوں کے لحاظ سے اس جملے میں ”نہیں“ کے ساتھ ”ہے“ لانے کی ضرورت نہیں۔ ایک چھوٹے سے مفرد جملے میں سے تین لفظ بہ آسانی کم کر دیے گئے۔ معنی مطلب میں ذرا سا بھی فرق نہیں پڑا، ذرا سی بھی کمی نہیں ہوئی، ہاں یہ ضرور ہوا کہ بندش کی چستی بڑھ گئی اور بیان کا حسن بھی بڑھ گیا۔



”ہی“ کے متعلق ایک ضروری بات سمجھ لیجیے۔ یہ قاعدہ ہے کہ ”ہی“ کا تعلق جس لفظ سے ہوگا، یہ اسی کے ساتھ آئے گا۔ ان دونوں کے درمیان کوئی اور لفظ نہیں آئے گا۔ مثال کے طور پر اس جملے کو دیکھیے: ”یہ خط ڈاکٹر صاحب کے ہی ہاتھ میں دینا“ اس جملے میں ”ہی“ کا تعلق ”ڈاکٹر صاحب“ سے ہے، اس لیے یوں لکھنا چاہیے تھا: یہ خط ڈاکٹر صاحب ہی کے ہاتھ میں دینا۔ ”کے“، ”نے“ سچ میں آکر جملے کو خراب کر دیا۔

”وہ دہلی میں ہی ملازمت ڈھونڈیں گے“ اس جملے میں ”ہی“ کا تعلق ”دہلی“ سے ہے، اس طرح لکھنا چاہیے تھا: وہ دہلی ہی میں ملازمت ڈھونڈیں گے۔ ایک صاحب نے تلفظ پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا: ”ان الفاظ میں ہی تلفظ کی تبدیلیاں ظاہر ہوتی ہیں جو استعمال میں زیادہ آتے ہیں“۔ بات تو ٹھیک ہے، مگر انداز بیان اچھا نہیں۔ ”ان الفاظ میں ہی“ اس قدر

مجھڑا لکڑا ہے۔ روانی نام کو نہیں۔ اچھا اب اسے یوں لکھیے: ”انہی الفاظ میں تلفظ کی تبدیلیاں ظاہر ہوتی ہیں۔۔۔“ اب ذرا ان دونوں ٹکڑوں کو دو تین دفعہ پڑھیے۔ آپ خود محسوس کر لیں گے کہ ”ان“ الفاظ میں ہی“ کے مقابلے میں ”انہی“ الفاظ میں ”روانی“ زیادہ ہے اور بیان کا حسن بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ”ان ہی“ کے بجائے ”انہی“ لکھنا بہتر ہے۔

”انہی“ اصل مرکب لفظ ہے۔ یہ ”ان“ اور ”ہی“ سے مل کر بنا ہے۔ ”ہی“ میں شوشے دار ؓ ہے، جسے ہائے ہوئے بھی کہتے ہیں ”انہی“ میں یہی ؓ، دو چشمی ؓ میں بدل گئی۔ اس طرح تلفظ آسان ہو گیا۔ ”ان ہی“ میں ؓ کی آواز الگ سے نکلتی ہے ”انہی“ میں تو ان کی آواز میں مل جاتی ہے اور اس طرح دو حرفوں کی الگ الگ آوازیں ایک بن جاتی ہیں۔ اس طرح تلفظ کے لحاظ سے اس میں سبک پن پیدا ہو جاتا ہے اور روانی آ جاتی ہے۔

○ ذرا اس مرکب جملے کو دیکھیے: ”اس وقت ہم اس ہی شخص کے متعلق بات کریں گے جو کل آیا تھا“۔ آپ اسے یوں لکھ کر دیکھیے: ”اس وقت ہم اسی شخص سے متعلق باتیں کریں گے۔۔۔“ آپ بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ جملہ، پہلے والے جملے سے بہتر ہے۔ وجہ بس یہی ہے کہ ”اس ہی“ کے بجائے ”اسی“ لکھا گیا ہے۔

اس ہی، اس ہی، ان ہی، ان ہی، وہ ہی، یہ ہی، سب ہی، جب ہی، تب ہی،۔۔۔ ان کی جگہ اسی، اسی، انہی، انہی، وہی، یہی، سبھی، جیسے، تبھی، بہتر معلوم ہوں گے۔ اس کا خیال رکھیے کہ جملوں میں انہی سے کام لیا جائے۔

میں نے ایک بار خط میں لکھا تھا: ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ وہ ہی کتاب بھیج دیجیے“۔ جن صاحب کو خط لکھا تھا، انھوں نے کتاب فوراً بھیج دی۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ جناب! ”وہ ہی کتاب“ لکھنا آپ

بات مکمل ہو جاتی ہے۔ اس سے صاف طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایسے ٹکڑوں میں عام طور سے ”پر“، ”زائد“ ہوتا ہے۔

عبارت میں قواعد کے لحاظ سے کوئی عیب نہ ہو، یہ اچھی بات ہے۔ زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ عبارت میں حسن بھی ہو۔ ”زائد ٹکڑے“ جملے میں آجاتے ہیں، تو عبارت کا حسن کم ہو جاتا ہے اور کبھی ختم ہو جاتا ہے۔

ہاں، یہ وضاحت کر دی جائے کہ ”اس بات پر“، ”اس موقع پر“، ”اس منزل پر“، ”جیسے ٹکڑے بالکل ٹھیک ہیں۔ ان میں کوئی عیب نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں ”پر“، ”زائد“ نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ”پر“ کے بغیر معہم مکمل نہیں ہوگا، جملہ بھی مکمل نہیں ہوگا۔ ”جہاں پر بیٹھے تھے“ اس میں سے ”پر“ کو نکال دیجیے، تب بھی جملہ مکمل رہے گا، بلکہ بہتر ہو جائے گا۔ یہ پہچان ہے اس کی کہ یہاں یہ لفظ ”زائد“ ہے۔ اس کے مقابلے میں اس جملے کو دیجیے: ”اس بات پر ہنسی آتی ہے“۔ اس میں ”پر“، نہ لکھا جائے تو جملہ مکمل نہیں ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں یہ لفظ ”زائد“ نہیں۔

ہم جب بھی کچھ لکھیں، ہمیں اسے بار بار پڑھنا چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ جملوں میں کچھ لفظ ”زائد“ تو نہیں۔ اسی طرح یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ عبارت میں کوئی جملہ یا جملے ”زائد“ تو نہیں۔ اس کی عادت ڈال لی جائے تو اکثر صورتوں میں تحریر ”زائد ٹکڑوں“ سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

ایک بات اور: پُرانی تحریروں میں ایسے جملے یا عبارتیں سامنے آئیں جن میں ”زائد“ لفظ یا ”زائد“ جملے ہوں، تو ان کو پُرانی بات سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہیے۔ اچھی نظر کیجیے۔ بڑی نشر کسی کی بھی ہو، نئے لکھنے والے کی یا پُرانے بزرگوں کی، اس کو مثال نہ بنائیے۔ کیا آج کل لوگ بڑی نشر نہیں لکھتے ہاتھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ اردو کے ممتاز افسانہ نگار انتظار حسین نے حال ہی میں ایک انٹرویو کے دوران کہا تھا: ”نثر اس زمانے میں بہت خراب لکھی جا رہی ہے اور مجھ سے وہ افسانہ نہیں پڑھا جاتا جو خراب نشر میں لکھا گیا ہو۔۔۔۔۔ پھر جب نشر اچھی نہیں لکھی گئی ہے تو افسانہ کیسے اچھا لکھا

جائے گا، (ماہ نامہ آجکل، فروری ۱۹۹۲ء)



جب نام سے پہلے ”ڈاکٹر“ یا ”پروفیسر“ لکھ دیا، تو پھر نام کے بعد ”صاحب“ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح جب نام سے پہلے ”جناب“ لکھ دیا، تو پھر نام کے بعد ”صاحب“ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر نام کے بعد ”صاحب“ لکھا ہے، تو پھر نام سے پہلے ”جناب“ لکھنا ضروری نہیں۔ ضروری کیا، مثلاً بھی نہیں۔ جناب ایڈیٹر صاحب، جناب ڈاکٹر صاحب، جناب پرنسپل صاحب، جناب رام لال صاحب، جناب محمود الہی صاحب، ان سب ٹکڑوں میں ”جناب“ اور ”صاحب“ میں سے ایک لفظ ”زائد“ ہے۔

کس جگہ نام سے پہلے ”جناب“ لکھا جائے اور کہاں نام کے بعد ”صاحب“ لکھا جائے، اس کا تعلق اس سے ہے کہ وہاں کون سا لفظ مناسب ہوگا۔ مثلاً ”جناب پرنسپل“ اور ”پرنسپل صاحب“ میں آخری ٹکڑا بہتر ہے۔ اسی طرح بھائی صاحب، مولوی صاحب، ایڈیٹر صاحب لکھنا چاہیے۔

خاص ناموں سے پہلے ”جناب“، لکھنا بہتر ہو سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک نام کے ساتھ ”جناب“ اور ”صاحب“ کو جمع نہ کیجیے۔ ”جناب محمد حسین خاں“ لکھیے، یا ”محمد حسین خاں صاحب“۔ ”جناب محمد حسین خاں صاحب منسوب نہیں۔ اسی طرح مثلاً پروفیسر آل احمد سرور۔ اگر ”پروفیسر آل احمد سرور صاحب“ لکھا جائے، تو کہا جائے گا کہ یہاں ”پروفیسر“ اور ”صاحب“ میں سے ایک لفظ ”زائد“ ہے۔ اگر کسی نے ”جناب پروفیسر آل احمد سرور صاحب“ لکھا ہے، تو کہا جائے گا کہ جناب، پروفیسر اور صاحب، ان تین لفظوں میں سے دو لفظ ”زائد“ ہیں۔

اسی طرح جب نام سے پہلے ”شری“ لکھ دیا تو پھر آخر میں ”صاحب“ لکھنا ضروری نہیں۔ جیسے: شری موہن لال اگر وال۔ اسے اگر ”شری موہن لال اگر وال صاحب“ لکھا جائے تو کہا جائے گا کہ یہاں ”شری“ اور ”صاحب“

میں سے ایک لفظ زائد ہے۔

بہت سے ناموں کے ساتھ اسم نسبت بھی شامل ہوتے ہیں، جیسے: فراق گورکھ پوری، جگر مراد آبادی، ظہیر احمد مدنی، شمس الرحمان فاروقی، مدتی الرحمان قدوائی۔ ایسے ناموں سے پہلے ”جناب“ لکھنا مناسب ہوگا۔ جیسے: جناب شمس الرحمان فاروقی۔

اگر کسی وجہ سے آخر میں ”صاحب“ لکھنا پڑے، تو پھر اسے آخر میں لکھنا چاہیے جیسے: ظہیر احمد مدنی صاحب، محمود سعیدی صاحب، ”صاحب“ کو برج میں نہیں آنا چاہیے، یعنی ”ظہیر احمد صاحب مدنی“، لکھنا مناسب نہیں۔ اب سے پہلے خطوں میں لمبے چوڑے القاب آداب لکھے جاتے تھے، اسی طرح ”صاحب“، اور ”جناب“، کو بھی ساتھ ساتھ لایا جاتا تھا۔ اب وہ روئیں بدل گئیں، وہ انداز باقی نہیں رہے۔ رات گئی، بات گئی۔ اب لفظی کفایت شعاری کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ہند آرمی کی طرح لفظوں کو بھی دیکھ بھال کر اور سوچ سمجھ کر استعمال کیجیے۔ جھگڑالو مردوں اور لڑاکا عورتوں کی طرح لفظوں کو بے دردی کے ساتھ صرف میں نہ لائیے۔ فضول خرچی کرنے والوں کو ”شیطان کا بھائی“ کہا گیا ہے۔ لفظوں کی قدر و قیمت تو روپوں سے کہیں زیادہ ہے، اس صورت میں لفظوں کی فضول خرچی کرنے والوں کو کیا کہا جائے گا؟



لفظوں کے انتخاب میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ جملے میں جتنے لفظ لکھے جائیں، ہر لفظ کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ”اس کا اطلاق کیا ہے؟“ (۲) معنی کیا ہیں۔ معنی کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس لفظ کو جملے میں کس جگہ اور کس ڈھنگ سے لانا چاہیے۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ کیا ہے۔ عبارت تو پڑھنے کے لیے لکھی جاتی ہے۔ اگر کوئی لکھنے والا اپنی لکھی ہوئی عبارت میں لفظوں

کو صحیح طور پر نہ پڑھ پائے، تو یہ بڑے شرم کی بات ہوگی۔ انشا اور تلفظ ۲۹ جن لفظوں کے معنی معلوم نہ ہوں، یا کچھ شک ہو، ان کو جملے میں نہیں لکھنا چاہیے۔ لغت میں دیکھ لینا چاہیے، یا استاد محترم سے پوچھ لینا چاہیے۔ جب اطمینان ہو جائے، تب لکھنا چاہیے۔ اس سلسلے میں احتیاط کرنے سے بعض دفعہ بڑی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک صاحب اپنے مضمون میں یہ لکھنا چاہتے تھے کہ فلاں صاحب کو بہت شہرت ملی۔ اس مطلب کو ادا کرنے کے لیے انھوں نے لکھا: ”ان کی خوب تشہیر ہوئی“، یہ مضمون ایک محفل میں پڑھا گیا لوگوں نے ”تشہیر“ پر اعتراض کیا۔ ان سے کہا گیا کہ اس سے تو ان کا مطلب نکلتا ہے کہ وہ بہت رسوا ہوئے، ان کی بہت بدنامی ہوئی۔ اعتراض درست تھا۔ ”تشہیر“ کے معنی ہیں: رسوا کرنا۔ پڑانے زمانے میں سزا دینے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مجرم کا منہ کا لاکر کے، اسے گدھے پر بٹھا کر، شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر گھمایا جاتا تھا۔ اس کو ”تشہیر“ کہتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب دربار اکبری میں ایک واقعہ لکھا ہے: ”لشکر خاں میر بخشی ایک دن شراب پی کر دربار میں آیا اور بدستیاں کرنے لگا۔ اکبر بہت خفا ہوا۔ گھوڑے کی دم سے بندھوایا اور لشکر خاں کو لشکر میں تشہیر کیا۔ سب نشے ہرن ہو گئے۔“

(دربار اکبری صفحہ ۷۷)

اگر ہم اپنی عبارت میں شہرت کے معنی میں ”تشہیر“ لکھیں تو ہماری رسوائی ہوگی۔ پڑھے لکھے لوگ کہیں گے کہ لکھنے والے کو اس لفظ کے معنی نہیں معلوم۔

○ ایک لفظ ہے ”بکواس“۔ فضول گفتگو کے مفہوم میں آتا ہے، جیسے: وہ تو بکواس کرتے ہی رہتے ہیں۔ ”بکنا“ مصدر ہے، اسی سے ”بکواس“ بنا ہے۔ اگر کوئی صاحب مثلاً یہ لکھیں: ”یہ فلم بکواس ہے“ تو ظاہر ہے کہ اس لفظ کا یہ صحیح استعمال نہیں ہوگا۔ سیدھا سا جملہ لکھا

۳۰۔ جاسکتا تھا: یہ فلم خراب ہے۔ فلم کی خرابی پر زور دینا مقصود ہو تو ”بہت“ کا لفظ بڑھا سکتے ہیں، مثلاً: ”یہ فلم تو بہت خراب ہے“۔ ”بکواس“ کا یہاں کیا کام۔ ”بکواس“ کا تعلق اندازِ گفتگو سے ہے۔

فکر کے معنی میں ”سوچ“ بعض لوگ بولتے اور لکھتے ہیں، جیسے: ”میری سوچ“ کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔ یہاں سوال یہ نہیں کہ یہ لفظ صحیح ہے یا غلط۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ لفظ اس معنی میں مستعمل نہیں رہا، اس لیے بہت اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ یہ لفظ فکر کے معنی میں ابھی تک زبان میں گھل بل نہیں سکا، اس لیے غیر فصیح لگتا ہے۔ اچھا یہی ہے کہ اسے فکر کے معنی میں استعمال نہ کیا جائے۔

○ ”اب کے“ اور ”اب کی“ دونوں لفظ صحیح اور مستعمل ہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ مفرد صورت میں ”اب کے“ لکھا جائے گا جیسے: اب کے تم آؤ گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔ اب کے گئے نہ جانے کب آؤ گے!

ط: اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

ط: اب کے بہار آئی تو سمجھو کہ ہم گئے

جب اس کے بعد کوئی لفظ اس سے متعلق ہو کر آئے گا، اس صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ وہ لفظ مذکر ہے یا مؤنث۔ وہ لفظ اگر مذکر ہے تو اس کے ساتھ ”اب کے“ آئے گا جیسے: اب کے برس، اب کے سال۔

اگر وہ لفظ مؤنث ہے تو ”اب کی“ آئے گا جیسے: اب کی بات۔ ایک مثل ہے: اب کی بات اب کے ساتھ، جب کی بات جب کے ساتھ۔

ایک ضمنی بات ————— اوپر مثال کے طور پر ”اب کے برس“ بھی لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں صرف یہ کہنا ہے کہ ”برس“ مذکر ہے۔ ایک برس گزر گیا، کہیں گے ”ایک برس گزر گئی“ نہیں لکھیں گے۔ اس کی جمع ”برسوں“ بنے گی، جیسے: مرے گھر وہ آئے تھے برسوں کے بعد۔ اس کی جمع ”برسیں“ نہیں بنے گی۔ مثلاً ”برسیں گز گئیں“، نہیں لکھیں گے

○ ————— سنہرا اور سنہری، دونوں لفظ استعمال میں آتے ہیں۔ یہ

انشا اور لفظ

۳۱۔ اسم صفت ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ موصوف مذکر ہوگا تو ”سنہرا“ لکھیں گے، جیسے: سنہرا بچہ، سنہرا رنگ۔ ط: روپ بکلی کا سنہرا ہے، پہلا بادل۔ موصوف مؤنث ہوگا تو ”سنہری“ لکھیں گے، جیسے: سنہری رنگت، سنہری جوتی۔ ط: تاکتا ہے تو ثریا کی سنہری بوتل۔



مصدر کے آخرین نا، ہوتا ہے، جسے علامت مصدر کہتے ہیں، جیسے: کرنا، سونا، جانا۔ جب مصدر کے ساتھ کوئی اسم آتا ہے، تب یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصدر کو کس طرح لکھیں گے، مثلاً ”کتاب پڑھنا“ لکھیں گے یا ”کتاب پڑھنی“ کہیں گے؟ یہ کہا گیا ہے کہ اس قاعدے میں دہلی اور لکھنؤ والوں کا اختلاف ہے۔ دہلی والے اسم مؤنث کے ساتھ ”نی“ لاتے ہیں، جیسے: روٹی کھانی، بات کہنی، چائے پینی، رائے دینی، تصویر دیکھنی۔ اسم اگر مذکر ہو تو ”نا“ لکھتے ہیں، جیسے: پانی پینا، پلاؤ کھانا، قلم اٹھانا، جواب دینا، لکھنؤ میں عام طور پر مصدر کی علامت میں تبدیلی نہیں کرتے۔ اسم مذکر ہو یا مؤنث، ہر صورت میں ”نا“ برقرار رہتا ہے، مثلاً: کتاب پڑھنا، رائے دینا، چائے پینا، پانی پینا، روٹی کھانا، بات کرنا، دعا کرنا، جادو جگانا۔

تہر گوالیاری، داغ دہلوی کے شاعر دیکھتے۔ ایک طرحی مشاعرے میں انھوں نے بھی غزل پڑھی۔ طرح کا جو مصرع تھا، اس میں قافیہ تھا: نظر۔ اور ردیف تھی: ہونا۔ تہر کی غزل کا مقطع یہ تھا:

یہاں ہیں تہر! اہل لکھنؤ بھی، اہل دہلی بھی

یہ کہتے ہیں سحر ہوئی، وہ کہتے ہیں سحر ہونا

یہ قاعدہ دہلی اور لکھنؤ کی نسبت کے ساتھ اسی طرح عمل میں آتا رہا ہے، اس لیے ہمارے لیے دونوں صورتیں درست اور صحیح ہیں، لیکن اچھا یہی ہوگا کہ کسی ایک طریقے کو مان لیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ مثلاً کوئی صاحب ”کتاب پڑھنا“ یا ”رائے دینا“ لکھتے ہیں، تو ان کے لیے یہ

۳۲ مناسب نہیں ہوگا کہ وہ ایک جگہ تو ”کتاب پڑھنا“ لکھیں اور کسی دوسری جگہ ”چاہے مینی“ یا ”دعا کرنی“ لکھیں۔ ایک ہی انداز کو اپنانا چاہیے۔



”نہیں“ کے ساتھ ”ہے“ یا ”ہیں“ لانا بہت سے مقامات پر اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ صاف صاف دکھائی دیتا ہے کہ ”ہے“ یا ”ہیں“ زائد لفظوں کی طرح آئے ہیں۔ مثلاً اس جملے کو دیکھیے: ”وہ شخص اپنی دکان پر موجود نہیں ہے“ یہاں ”ہے“ بے کار نظر آتا ہے۔ اس جملے کو اگر اس طرح لکھا جاتا: ”وہ شخص اپنی دکان پر موجود نہیں“ تو بات بھی مکمل ہو جاتی اور بیان کے لحاظ جملہ بہتر ہو جاتا۔ یا محض یہ طور مثال اس عبارت کو دیکھیے: ”وہ ہمیں آتے جاتے نہیں ہیں، دن بھر گھر میں بیٹھے رہتے ہیں“۔ اسے اگر یوں لکھا جائے: ”وہ ہمیں آتے جاتے نہیں ہیں، دن بھر گھر میں بیٹھے رہتے ہیں“ تو واضح طور پر معلوم ہوگا کہ یہ بہتر صورت ہے۔ پہلے جملے میں ”نہیں ہیں“ میں ”ہیں“ صاف طور پر زائد معلوم ہوتا ہے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ ”نہیں ہے“ یا ”نہیں ہیں“ یہ دونوں ٹکڑے بہت سے مقامات پر حسن بیان کے لحاظ سے غیر مناسب نظر آتے ہیں۔ جب بھی فعل کی اس صورت کو استعمال کیا جائے تو یہ ضرور دیکھ لیا جائے کہ اداے مطلب اور حسن عبارت کے اعتبار سے صورت حال کیا ہے۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ اکثر مقامات پر ”نہیں“ اور ”ہے“ کا ساتھ ساتھ آنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً: ”کوئی شخص جان بوجھ کر نقصان اٹھانا گوارا نہیں کرتا ہے“ یہاں بھی ”ہے“ زائد معلوم ہوتا ہے۔ اس کی بہتر صورت یہ ہو سکتی ہے: ”کوئی شخص جان بوجھ کر نقصان اٹھانا گوارا نہیں کرتا“۔ زائد لفظ عام طور پر عبارت کو گھاڑ دیا کرتے ہیں، ایسے مقامات پر ”ہے“ بھی یہی کیا کرتا ہے ”نہیں ہیں“ میں بھی بہت سے مقامات پر یہی خرابی چھپی ہوئی ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات ضرور نظر میں رہنا چاہیے کہ ایسے مقامات بھی سامنے

انشا اور لفظ

۳۳ آتے ہیں جہاں ”نہیں ہے“ یا ”نہیں ہیں“ غیر مناسب نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً اس جملے کو دیکھیے: ”بہ لفظ ابھی تک زبان میں گھل مل نہیں سکا ہے۔ اس جملے میں وہ بات نہیں جو مثلاً اس جملے میں ہے: ”وہ گھر میں جلتے نہیں ہیں“ یوں کہ اس آخری جملے میں ”ہیں“ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تکھنے والے کی یہ دقت داری ہے کہ وہ دیکھ لے کہ ”نہیں“ کے ساتھ ”ہے“ یا ”ہیں“ لانا کس مقام مناسب ہے اور کہاں غیر مناسب۔ مثلاً یہ پوچھا جا: ”وہ گھر میں ہیں؟“ اس کا جواب صرف ”نہیں“ بھی ہو سکتا ہے اور ”نہیں ہیں“ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب یہ کہنے والے پر ہے کہ وہ سمجھ لے کہ یہاں ”ہیں“ ضروری ہے یا غیر ضروری۔ ذرا اس عبارت کو دیکھیے:

”آپ نے ”نگہت“ لکھا ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اصل لفظ ”نگہت“ ہے۔ ”تون“ کے اوپر زبر ہے اور ”تون“ کے بعد کاف ہے، ”کاف“ نہیں ہے۔“

اس عبارت کے آخر میں ”نہیں ہے“ آیا ہے۔ ”نہیں“ کے بعد ”ہے“ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح ”تون“ کے اوپر ”کے بجائے“ ”تون“ پر ”کھنا“ بہتر تھا۔ ”تون“ کے اوپر زبر ہے اور ”تون“ کے بعد کاف ہے۔ ”اس ٹکڑے میں لفظ ”تون“ کی تکرار کھٹکتی ہے، خاص کر یوں کہ دونوں لفظوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں۔ اس عبارت کو اس طرح لکھا جاسکتا تھا:

”آپ نے ”نگہت“ لکھا ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اصل لفظ ”نگہت“ ہے۔ ”تون“ پر زبر ہے اور اس کے بعد کاف نہیں، ”کاف“ ہے۔“

اصل بات تو مکمل ہو گئی۔ اب ضمنی طور پر یہ کہنا ہے کہ واقعی اصل لفظ ”نگہت“ ہے۔ ”تون“ پر زبر ہے اور اس کے بعد کاف ہے ”ن“ کا۔ ”ن“ کے معنی ہیں: خوش بو۔ اسے ”نگہت“ نہیں لکھنا چاہیے اور بولنا چاہیے ”تون“ کے زبر کے ساتھ۔

ہاں شاعری میں ”نہیں ہے“ کچھ زیادہ ملتا ہے۔ شاعری کی بات الگ رہی

یہاں نشر کی بات ہو رہی ہے۔ نشر میں اس طرف خاص طور سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔



یہ بات نکھی جا چکی ہے کہ جملے میں جس قدر مفرد لفظ لکھے جائیں، اُن کے معنی معلوم ہونا چاہیے۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اُن کو جملے میں کس جگہ اور کس طرح لایا جائے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ عبارت میں اگر مرکب لفظ آئے ہوں تو اُن کے متعلق بھی اطمینان کر لیا جائے۔

ایک مضمون میں یہ جملہ لکھا ہوا تھا: ”اہلِ ہند کی کتابوں میں یہ سب باتیں
 نکلی ہوئی ہیں۔“ ————— ”اہلِ ہند، صیح ترکیب نہیں تے اہلِ ہند، ضرور
 صیح مرکب ہے، اس کے معنی ہیں: ہندستان والے۔ اس میں ہندو
 مسلمان، سکھ عیسائی (وغیرہ) بھی شامل ہیں۔ اس جملے میں ”اہلِ ہند، کا
 محل نہیں، یوں لکھنا چاہیے تھا: ہندوؤں کی کتابوں میں۔۔۔۔۔“ اہلِ
 ہندو کے تو کچھ معنی ہی نہیں۔

○ کسی مضمون یا کتاب وغیرہ کی تعریف میں یہ کہنا کہ یہ معرکتہ الآراء مضمون یا کتاب ہے، یا مثلاً کسی غزل کی تقریب میں یہ کہنا کہ بڑے معرکتہ الآراء غزل کہی ہے، درست نہیں۔ تعریف کے سہارے اس سے تو بڑائی ظاہر ہوگی، یعنی بات ہی بدل جائے گی، بل کہ یوں کہیں کہ بگڑ جائے گی۔

”معرکتہ الآراء“ کے معنی ہیں: جس میں اختلاف رائے بہت ہو۔ اصل میں ”معرکتہ الآراء“، تنحاً، یعنی آخر میں حمزہ بھی تنحاً اردو میں آکر حمزہ تو نکل گیا (اس لیے کہ وہ تلفظ میں نہیں آتا تنحاً) ”معرکتہ الآراء“ رہ گیا۔ ”آراء“ جمع ہے ”راے“ کی۔ یہ عربی کا لفظ ہے۔

ایک اور مرکب ہے: معرکہ آرا۔ اس میں ”آرا“ فارسی کا لفظ ہے ”آراستن“ مصدر سے بنا ہے۔ ”معرکہ آرا“ کے معنی ”زبردست، پُر زور،“ بھی ہیں۔ اسی نسبت سے عہدِ غزل کو ”معرکہ آرا“ کہہ دیتے ہیں۔ معرکہ کی غزل کہی

۳۵
ہے، معرکہ آرا غزل کہی ہے؛ یہ مسیح اندازِ بیان ہو گا۔ اگر اس جگہ "معرکہ آرا" کہا جائے گا تو اس کا مطلب اس سے مختلف ہو گا۔

○ — ایک مرکب ”جیب و گریباں“ کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے۔
اس کی ترکیب کو سمجھ لینا چاہیے، تاکہ غلطی نہ ہو۔

”جیب“ اور ”جیب“ دو مختلف لفظ ہیں۔ ”جیب“، موٹا ہے، جو مثلاً
اس شعر میں آیا ہے :

ہم کہیں آتے اس فریب میں ہیں
 تم سے سوا ایسے میری جیب میں ہیں

یہی ”جیب“ کبھی کبھی کٹ بھی جایا کرتی ہے۔ اسی سے ”جیب کٹر“ بنا ہے۔۔۔ ”جیب“ دوسرا لفظ ہے۔ اس میں جیم پر زبر ہے اور یہ مذکر ہے، جو مثلاً مرزا دہر کے اس شعر میں آیا ہے :

تھی صبح یا وہ چرخ کا بیب دریدہ تھا
یا چہرہ میس کا رنگ پریدہ تھا
یا مثلاً مرزا غالب کا یہ شعر:

چمک رہا ہے بدن پر لہو سے پیرا ہن
ہمارے جیب کو اب حاجتِ زکو کیا ہے
یا جیسے غالب ہی کا یہ شعر:

دیوانگی سے دوش پہ زنا رکھی نہیں
یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں

”جیب“ کے معنی ہیں: گریبان۔ اس لحاظ سے ”جیب و دامن“، ”صحیح مرتب“ ہے۔ اس کے معنی ہوئے: دامن اور گریبان۔ اس کے برخلاف ”جیب و گریباں“، ”صحیح مرتب“ نہیں، کیوں کہ دونوں لفظوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ ”جیب و گریباں“ کے معنی ہوئے: گریبان گریبان۔ ان دونوں لفظوں ”جیب“ اور ”جیب“ میں امتیاز کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اگر یہ بات ذہن میں نہیں ہوگی تو تعین ممکن ہے کہ غالب کے شعروں میں ”جیب“ کو ”جیب“

پڑھا جائے (ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے) اور مصرعے کو بے معنی بنا دیا جائے۔

○ — ایک مرکب ہے ”خط و خال“، اسے ”خط و خال“ بھی لکھا گیا ہے۔ یہاں بھی وہی بات ہے ”خط و خال“ اور ”خال“ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں: تہل۔ ”خط و خال“ لکھنا چاہیے۔



صفت کے تین درجے ہیں: اچھا، بہت اچھا، سب سے اچھا۔ ان میں سے ہر کلمہ یا معنی ہے؛ لیکن ہم اسے بے جگہ استعمال کریں گے تو بے معنی بن جائے گا۔ کسی معمولی دست کار کے لیے کہا جائے کہ وہ تو بہت اچھا کاریگر ہے، تو یہ بجا صرف ہوا۔ اسی کے لیے اگر کہا جائے کہ وہ بہترین کاریگر ہے، تو یہ پہلے سے بھی بڑھ کر غیر مناسب صرف ہوا۔ بہترین کا وہی مفہوم ہے جو ”سب سے اچھا“ کا ہے۔

یاد رکھیے کہ ہر اسم صفت ایک بیان ہے۔ جب ہم کوئی اسم صفت جملے میں لکھتے ہیں، تو گویا ہم ایک بیان دیتے ہیں، جس کی پوری ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ معمولی جلسے کے لیے یہ کہنا کہ عظیم الشان جلسہ تھا، غلط بیان دینے کے برابر ہے۔ معمولی شاعر کے لیے یہ کہنا کہ وہ بہت اچھا شاعر ہے، یا یہ کہنا کہ وہ صاحب طرز شاعر ہے، جھوٹی گواہی دینے کے ہم معنی ہے۔ اسم صفت بہت سے ہیں، جیسے: اچھا، بُرا، اعلیٰ، ادنا، بے مثال، بے نظیر، عظیم الشان (وغیرہ)۔ یہ تحریریں آنے رہتے ہیں اور گفتگو میں بھی شامل ہوتے ہیں۔ ہم ان کو غیر مناسب طور پر استعمال میں لائیں گے، تو اس سے دو بڑے نقصان ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ ان لفظوں کا مفہوم بگڑ کر رہ جائے گا۔ دوسرے یہ کہ ہماری تحریر میں خرابی پیدا ہو جائے گی اور ہم غلط بیانی کے مجرم قرار پائیں گے۔ اگر ہم صفاتی لفظوں کو غیر مناسب طور پر استعمال کرنے کے عادی بن جائیں گے، تو دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے

جھوٹ بولنے کی عادت ڈال لی ہے۔ یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ جھوٹے کی بات اعتدال کے قابل نہیں رہتی۔

شاعروں کو جو بہت سی آڑیاں حاصل ہیں، ان میں مبالغہ بھی شامل ہے؛ لیکن نشر لکھنے والا ان کی راہ پر نہیں چل سکتا۔ نشر کے آداب شاعری کے مسئلہ طور طریقوں سے مختلف ہیں۔ شاعر اسم صفت کو جس طرح استعمال کر لیتا ہے، نشر لکھنے والا اس آڑی اور آسانی کے ساتھ ان سے کام نہیں لے سکتا۔ نشر نگار اور شاعر دو الگ الگ راہوں کے راہی ہوتے ہیں۔

”بہتر“ اسم صفت ہے اور یہ صفت کا دوسرا درجہ ہے۔ درجوں کی ترتیب یہ ہے: بہتر، بہترین۔ اسی ترتیب کے ساتھ ان کے معنی ہیں: اچھا، بہت اچھا، سب سے اچھا۔ ”بہتر“ مرکب لفظ ہے۔ ”بہ“ اور ”تر“ سے مل کر بنا ہے۔ ”بہ“ کے معنی ہیں: اچھا۔ ”تر“ کے معنی ہیں: زیادہ۔ اس طرح ”بہتر“ کے معنی ہوئے: زیادہ اچھا یا بہت اچھا۔ اس جملے کو دیکھیے: ”وہ کام زیادہ بہتر ہے۔“ ظاہر ہے کہ معنی کے لحاظ سے ”زادہ“، قاتل تو ٹھہرے گا۔ ”بہتر“ کے تو خود ہی معنی ہیں: زیادہ اچھا۔

خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ جب کسی اسم کے ساتھ ”بہتر“ لایا جائے، تو پھر اس کے ساتھ ”زیادہ“، جیسے لفظ نہ لکھے جائیں۔ مثال کے طور پر اس جملے کو دیکھیے: ”زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس کام کو کیا ہی نہ جائے۔“ اس میں ”زیادہ“ کی ضرورت نہیں، یوں کہ ”بہتر“ کے معنی ہیں: زیادہ اچھا۔ ایک اور جملہ: ”آپ کا یہ افسانہ، پہلے افسانے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔“ اس جملے میں ”بہت“، زائد ہے۔ ”بہت“ اور ”زیادہ“، ان دونوں لفظوں کو ایسے لفظوں کے ساتھ نہیں لانا چاہیے جن کے آخر میں ”تر“، ہو۔ مثلاً ایسے جملے نہیں لکھنا چاہیے: بہت بدتر ہے، بہت بہتر ہے، زیادہ بہتر ہے، بہت کم تر ہے۔

کم تر، بیش تر، بدتر، خوب تر، ان سب مرکب لفظوں میں ”تر“،

یہ طور لاحقے کے آیا ہے اور اس کے معنی ہیں: زیادہ۔ اس طرح ”کم تر“ کے معنی ہیں: بہت کم۔ ”بیش تر“ کے معنی ہیں: بہت زیادہ۔ ”بدتر“ کے معنی ہیں: بہت بُرا یا زیادہ بُرا۔ اسی طرح ”خوب تر“ کے معنی ہوئے: زیادہ اچھا یا بہت اچھا۔ مولانا حالی کے اس مصرعے سے اس مرکب کا مفہوم ابھی طرح سمجھ میں آسکے گا:

سے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

خوب سے خوب تر: اچھے سے اچھا، بہت اچھا، زیادہ اچھا۔ اگر کوئی شخص کہے کہ ”وہ فلم تو بہت خوب تر ہے“، تو آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ ”بہت خوب تر“، ٹھیک نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی یہ کہے کہ ”یہ کام بہت بہتر ہے“، تب بھی آپ کے ذہن میں یہی خیال آنا چاہیے کہ یہ ٹھیک نہیں۔ ”بہت خوب تر“، ہو یا ”بہت بہتر“، دونوں میں ”بہت“، نائد ہے۔ ہاں، ”بہت کم“، ”بہت خوب“، ”بہت زیادہ“، ”بہت بُرا“، ”بہت اچھا“، جیسے مکڑے بالکل صحیح ہیں، کیوں کہ ان میں ”بہت“، نائد نہیں۔ ”بہت بُرا“، ٹھیک ہے، مگر ”بہت بدتر“، درست نہیں، یوں درست نہیں کہ ”بدتر“، میں خود ”تر“ کے معنی ہیں: بہت۔ پھر اس کے ساتھ ”بہت“، کیسے آسکتا ہے۔



جملہ معترضہ کو تو سین میں نکھاجا تا ہے۔ جملہ معترضہ ایسے جملے یا عبارت کو کہتے ہیں جو اصل بات کا لازمی حصہ تو نہ ہو، مگر اسے کسی طرح کی ایسی نسبت حاصل ہو کہ نکلنے والے کی رائے میں اس کا بھی نکھاجانا ضروری سا ہو۔ مثال کے طور پر: مرزا صاحب نے (جن سے آپ مل چکے ہیں) کہلا بھیجا ہے کہ میں کل آؤں گا۔ ”جن سے آپ مل چکے ہیں“، جملہ معترضہ ہے۔ یہ اصل بات کا حصہ تو نہیں، مگر نکلنے والے کے خیال میں اس کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ جملہ معترضہ اگر عبارت میں شامل ہو تو اس کا لحاظ رکھا جائے کہ عبارت بے ربط نہ ہونے پائے۔ مثال کے طور پر اسی جملے کو اس طرح نکھ کر دیکھیے: ”مرزا صاحب (جن سے آپ مل چکے ہیں) نے کہلا بھیجا ہے کہ میں کل آؤں گا“۔ اس جملے میں بے ربطی کا عیب موجود ہے۔ عیب یہ ہے کہ ”نے“، بے جگہ آیا ہے۔

اس جملے کو دیکھیے: ”محمد حسین خاں صاحب (جن کے بھائی نکھو میں تھیں) نے کہا“۔ اس میں ”کو“، بے جگہ آیا ہے۔ یوں نکھنا چاہیے تھا: محمد حسین خاں صاحب کو جن کے بھائی نکھو میں تھیں (دارین) میں ابھی تک خط نہیں لکھ سکا۔

بے ربطی کا عیب کئی صورتوں میں پیدا ہو جاتا کرتا ہے۔ سب کی مثالیں دینا مشکل ہے۔ خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ جب بھی عبارت میں جملہ معترضہ کے طور پر کوئی جملہ یا عبارت آئے، تو دیکھ لیا جائے کہ تو سین سے پہلے اور تو سین کے بعد کی عبارت میں کسی طرح کی بے ربطی تو پیدا نہیں ہوئی۔ سین لفظ کر یا لفظوں کو پہلے تو سین سے پہلے آنا چاہیے تھا، وہ دوسرے تو سین کے بعد تو نہیں آگئے۔ اوپر کے دونوں جملوں کو مثال کے طور پر سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ پہلے جملے میں ”نے“، اور دوسرے جملے میں ”کو“، کی صحیح جگہ تو سین سے پہلے ہے۔ جب ان کو تو سین کے بعد نکھاجائے گا تو کہا جائے گا کہ عبارت میں تعقید پیدا ہو گئی ہے۔ تعقید، کا مطلب یہ ہے کہ اداسے مطلب کے لحاظ سے جملے میں کسی لفظ کو جہاں آنا چاہیے تھا وہ اُس جگہ سے ہٹ کر آیا ہے۔ اسے عیب مانا جاتا ہے۔ تعقید سے اہل خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ روائی ختم ہو جاتی ہے اور بیان کا حسن مایوس ہو جاتا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے ایک اور مثال۔ ہمارے ایک مشہور ادیب نے لکھا ہے: ”رفتہ رفتہ غالب کے مولوی سراج الدین احمد سے تعلقات میں گہرائی پیدا ہو گئی“۔ اس جملے کو دو تین بار پڑھیے۔ آپ خود

انشاء و تعلق

محسوس کریں گے کہ پہلے مکتوب میں ”کے“ بے جگہ آیا ہے اور ”سے“ بھی عبارت میں لکھا نہیں، آگھر ”اکھڑا سا لگتا ہے۔ اس جملے کو اس طرح لکھ کر دیکھیے: رفتہ رفتہ غالب اور مولوی سراج الدین احمد کے تعلقات میں گہرائی پیدا ہو گئی۔ اب بات صاف ہو گئی۔ اُس جملے میں ”کے“ بے جگہ آیا تھا اور ”سے“ زائد تھا۔ ان دونوں نے مل کر عبارت کی خوبی کو دھندلا دیا تھا۔ تعقید کا عیب پیدا ہوا، جس نے روانی پر مبرا اثر ڈالا اور ایک زائد لفظ نے بندش کی جتنی کو نقصان پہنچایا۔ جب ”کے“ صحیح جگہ آیا، وہ عیب جاتا رہا اور ”سے“ جو زائد تھا، وہ اپنے آپ نکل گیا۔

اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ جب بھی کوئی جملہ لکھا جائے تو یہ دیکھ لیا جائے کہ اُس میں کوئی لفظ اولے مطلب کے لحاظ سے بے جگہ تو نہیں آگیا۔ یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ زائد لفظ تو عبارت میں شامل نہیں ہو گیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عبارت میں تعقید کا عیب پیدا ہو جائے، تو وہ عبارت اپنا حسن کھو دیتی ہے۔



روزمرہ اور محاورہ، ان دونوں کا ذکر شروع میں آچکا ہے۔ یہ لکھا جا چکا ہے کہ گفت گو اور تحریر، دونوں کو روزمرہ کے مطابق ہونا چاہیے۔ جیسے ”پانی پینا، روزمرہ ہے، یعنی اردو والے ”پانی پینا“ کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اُس کی جگہ ”آب پینا“ کہے، تو اُسے روزمرہ کے خلاف کہا جائے گا۔ ”پانی“ اور ”آب“، دونوں کے معنی ایک ہیں ”آب پینا“ کے معنی ”پانی پینا“ ہوئے۔ پھر بھی اسے درست نہیں کہا جائے گا۔ وجہ یہی ہوگی کہ اردو والے ”پانی پینا“ کہتے ہیں، ”آب پینا“ نہیں کہتے۔ روزمرہ کی تعریف لکھی جا چکی ہے، یعنی اُس طرح لکھنا اور بولنا، جس طرح معیاری اردو میں لکھتے اور بولتے ہیں۔

روزمرہ کی طرح محاورے کا صحیح ہونا بھی ضروری ہے۔ محاورے

انشاء و تعلق

میں مجازی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک محاورہ ہے ”ناک کٹنا“۔ اس کے معنی ہیں: کسی کے آگے ذلیل و خوار ہونا، جسکی ہونا۔ یہ مجازی معنی ہیں۔ اگر کسی کی ناک پر پتھر ترش گئی ہو اور کہا جائے کہ اُس کی ناک کٹ گئی، تو اس صورت میں اسے محاورہ نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ یہ حقیقی معنی ہیں ”ناک“ سے پتھر کی ناک مراد لی جائے، تو یہ حقیقی معنی ہوں گے۔ اگر ”ناک“ سے ”عزت و آبرو“ مراد لی جائے تو یہ مجازی معنی ہوں گے۔

خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ محاورے کو اسی طرح استعمال کیا جائے جس طرح وہ مستعمل رہا ہے۔ اس میں کسی طرح کی تبدیلی نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جس جگہ محاورے کو دیا کسی خاص حرکت کو استعمال کیا جائے، تو یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ معنی مطلب کے لحاظ سے یہاں ایسا کوئی پہلو تو پیدا نہیں ہو جائے گا جو لکھنے والے یا بولنے والے کے اصل مفہوم سے مختلف ہو۔ اس سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ یاد آگیا۔

میر ناصر علی دہلوی اپنے زمانے کے بہت مشہور ادیب تھے۔ اُن کا رسالہ صلائے عام آج تک اپنے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ میر صاحب کی نشر اور اُن کی زبان دانی کی اُس زمانے میں دھوم تھی۔ دہلی کے مشہور ادیب شاہد احمد دہلوی مرحوم نے میر صاحب کا خاکہ لکھا تھا، جو اُن کے مجموعہ مضامین گنجینہ گوہر میں شامل ہے۔ اُس میں کئی دل چسپ واقعات لکھے ہیں۔ اُن میں سے ایک واقعہ آپ سن لیجیے۔ منظر یہ ہے کہ ایک صاحب ملنے کے لیے آئے ہیں اور بیٹھے ہوئے بائیں کر رہے ہیں۔ باقی واقعہ شاہد صاحب کے الفاظ میں:

”عقیدت مند نے بڑی لجاجت سے کہا: آپ کو زحمت دینے کی معافی مانگنا ہوں۔

میر صاحب تنگ کر بولے: میاں صاحب زادے! معافی کیا مانگتے ہو، بھیک مانگو بھیک۔ وہ بچارے اپنا سامنے لے کر رہ گئے غلط

اردو سن کر میر صاحب آپ سے باہر ہو جاتے تھے، مطلب یہ ہے کہ ان صاحب کو کہنا چاہیے تھا کہ ”معافی چاہتا ہوں“۔ معافی چاہنا اور معافی مانگنا، اپنی اپنی جگہ دونوں بامعنی ہیں، لیکن دونوں کے استعمال کے موقع الگ الگ ہیں۔ کسی شخص نے کوئی ایسی بات کہی جو کہیں کہنا چاہیے تھی، یا کوئی ایسا کام کیا جو مناسب نہیں تھا، ایسے موقعوں پر کہنا کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ معذرت کی جائے اور کہا جائے: ”معافی چاہتا ہوں۔ یعنی ایک جہد آدمی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس نے غلطی کا اعتراف کیا اور تمیز داری کے آداب کے ساتھ معذرت کی۔

دوسری صورت اس سے مختلف ہے۔ ذرا دیر کے لیے مان لیجیے کہ ایک صاحب کسی سیاسی ایکٹیشن میں شامل ہو کر جیل چلے گئے۔ جیل کی سختیوں سے گھر کر یا کسی اور وجہ سے صلح سمجھوتے پر اتر آئے اور معافی مانے پر دستخط کر کے جیل سے باہر آ گئے۔ ایسے صاحب کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ تو معافی مانگ کر چلے آئے، انھوں نے معافی مانگ لی۔ یہ تو آپ مانیں گے کہ اس میں بُرائی کا پہلو جھلک رہا ہے۔ یہاں معافی مانگنے اور بھیک مانگنے میں کچھ فرق نہیں رہا۔ ”معافی مانگنا“ میں کبھی بُرائی کا اور کبھی طعن کا مفہوم شامل ہوتا ہے، اس پر نظر رکھنا چاہیے۔

○ ایک صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا تھا: ”ایک بے نا سبک اس کے سینے میں نہیں مارتی تھی“ اتفاق یہ ہوا کہ ایک جلسے میں انھوں نے یہ مضمون پڑھا۔ کئی سنے والوں نے سر محفل کہا کہ: ”ٹیس مارنا، درست نہیں۔ اعتراف صبح تھا۔ سچا رہے کو بھری محفل میں شرمندہ ہونا پڑا۔

میر انیس کا مشہور شعر ہے:

کھا کھلے اس اور بھی سبز ہرا ہوا

تھا موتیوں سے دامن محسرا بھر ہوا

مولانا قبل نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ اس شعر میں ”اوس“ کی جگہ

”شبم“ لکھا جائے، تو شعر کی فصاحت ختم ہو جائے گی۔ مشہور استاد اور زبان داں آرزو نکھوی نے اپنی کتاب نظام اردو میں اس شعر سے متعلق یہ وضاحت کی ہے کہ یہاں ”شبم“ اس لیے بے محل ہو گا کہ محاورہ ہے ”اوس کھانا“۔ ”شبم کھانا“ محاورہ نہیں۔ میر انیس تو زبان، روزمرہ اور محاورے کی نزاکتوں سے خوب واقف تھے، اسی لیے انھوں نے ”کھا کھلے“ ”شبم“ نہیں لکھا۔

○ ایک بڑے ادیب نے لکھا ہے: ”انھوں نے اول درجے میں بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا تھا۔“ اس جملے میں روزمرہ کی غلطی ہے۔ روزمرہ ہے: امتحان میں کامیاب ہونا۔ امتحان کا میاب کرنا، روزمرہ نہیں۔

○ بعض لوگ ”استفادہ حاصل کرنا“ لکھتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ ”استفادہ کرنا“ مستعمل ہے۔ مثلاً: انھوں نے مغربی علوم حاصل کیے تھے اور مشرقی علوم کے باہرین سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اگر یہاں ”استفادہ حاصل کیا تھا“ لکھا جائے، تو جملہ غلط ہو جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ ”استفادہ“ میں حاصل کرنے کا مفہوم شامل ہے۔ ”استفادہ حاصل کیا“ میں لفظ ”حاصل“ زائد ہے، اسی لیے ”استفادہ کرنا“ صحیح ہے اور ”استفادہ حاصل کرنا“ درست نہیں۔

○ سید مسعود حسن رضوی (مرحوم) مشہور ادیب اور زبان داں تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے ایک مضمون میں مرحوم کا ایک واقعہ لکھا ہے: ”جملوں میں لفظوں کا صحیح دروبست اور ہر لفظ کی معنوی پرتو

پر نظر، ان کی تحریر اور گفتگو، دونوں کا وصف ہے۔

ایک بار جو شمس یلح آبادی نے، جو خود زبان داں تھے اور لفظ لفظ کی صحت کا خیال رکھتے تھے، اپنی مشہور نظم پڑھی جس

کا ٹیپ کا مصرع تھا:

رواں دواں بڑھے چلو، رواں دواں بڑھے چلو

داد سے چمتیں اڑ گئیں۔ جلسے کے بعد چاہے پر مسعود صاحب نے جوش ملیح آبادی کو الگ بلانے کی بڑی نرمی اور شائستگی سے کہا: ”جوش صاحب! جب یہ نظم شائع کریں تو یہ نوٹ ضرور دے دیجیے گا کہ ”رواں دواں“ یہاں لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے، محاورے کے اعتبار سے نہیں۔

جوش صاحب چونکہ ہو گئے، بولے: ”اور محاورے میں اس کا کیا مفہوم ہے؟“ مسعود صاحب نے بتایا ”رواں دواں“ کا محاورے کے اعتبار سے وہ مفہوم ہے جو صفی لکھنوی نے یتیموں کے بارے میں اپنی نظم میں ادا کیا ہے:

رواں دواں ہیں، غریب الدیار ہیں ہم لوگ
رواں دواں، یعنی مارے مارے پھرنے والے، بے سہارا لوگ

(غالب نامہ مسعود حسن صوفی نمبر)

اس لفظ ”رواں دواں“ کا یہ معنی پہلو جوش صاحب کی نظر میں نہیں تھا، یوں وہ اس طرح لکھ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معنوی خرابی کا پہلو نکل آیا اور اس طرح مفہوم بگڑ گیا۔ انھوں نے کہنا یہ چاہا تھا کہ زور شور اور عزم و ارادے کے ساتھ آگے بڑھے چلو۔ مگر اس میں یہ پہلو پیدا ہو گیا کہ مارے مارے پھرنے والے بے سہارا لوگوں کی طرح چلتے رہو۔

○ ایک مشہور لکھنے والے نے ایک صاحب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: ”بوڑھے ہو چکے ہیں، بیمار رہتے ہیں، پھر بھی روزانہ لائبریری جاتے ہیں۔ سچ ہے، چور چوری سے جاتے، ہیرا پھیری سے کیا جائے۔“ کیسی بڑی غلطی ہوئی کہ تعریف کے بجائے بُرائی نکل آئی۔ بیشل ”چور چوری سے جاتے۔۔۔“ تعریف کے موقع پر استعمال میں نہیں آتی۔ کسی کی بُرائی کرنا ہو، تب لکھتے ہیں۔

○ اردو زبان کی جو خوبیاں بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ باتوں میں سلیقے اور تمیز کی روشنی شامل ہوتی ہے۔

اگر یہ بات درست ہے اور آپ کو بھی اس سے اتفاق ہے تو ذرا دیر کے لیے اس طرف توجہ کیجیے۔ ایک عزیز دوست آپ سے ملنے کے لیے آتے ہیں۔ آپ ان کی خاطر تواضع کرتے ہیں، ادب آداب کے ساتھ پیش آتے ہیں اور خوش سلیقگی کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ جب وہ چلنے لگتے ہیں تو ادب جہان فازی کے مطابق آپ کچھ دور تک ان کے ساتھ چلتے ہیں اور بہت خلوص کے ساتھ کہتے ہیں: ”اے بے میں آپ کو بس اسٹینڈ تک چھوڑاؤں۔“ آپ ذرا سی توجہ سے کام لیں تو خود محسوس کریں گے کہ بے خیالی میں ایک غیر مناسب جملہ آپ کے منہ سے نکل گیا۔ بات یہ ہے کہ کچھ جملوں میں روز مرہ کے لحاظ سے ”چھوڑنا“، اچھے مفہوم میں استعمال نہیں کیا جاتا، ترک تعلق کا مفہوم نکلتا ہے۔ یہ جملہ بھی اسی انداز کا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں: فلاں شخص نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا۔ یا جیسے ایک بلی بہت پریشان کرنے لگی۔ کبھی دودھ پی گئی، کبھی گوشت کھا لیا۔ کسی ترکیب سے اس کو بکڑ لیا۔ بوری میں یا بڑے تھیلے میں بند کر دیا اور کہا: جاؤ اسے دریا پار چھوڑ آؤ۔ تو یہ ہے چھوڑ آنے کا مفہوم۔ اب آپ ہی غور کیجیے کہ آپ کی بات کیسی بگڑی! آپ کہنا تو یہ چاہتے تھے کہ میں بس اسٹینڈ تک ساتھ چلوں گا، اور مطلب یہ ہو گیا کہ آپ ان صاحب کو (بلی کی طرح) چھوڑنے جارہے ہیں۔ ایسے جملے سننے میں آجایا کرتے ہیں: میں بچے کو اسکول چھوڑنے جا رہا ہوں۔ میں ان کو اسٹیشن چھوڑنے جاؤں گا (وغیرہ)۔ یہ غیر مناسب انداز بیان ہے۔ آسانی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بس اسٹینڈ تک آپ کے ساتھ چلوں گا، یا میں وہاں تک آپ کا ساتھ دوں گا۔ اور بھی مناسب انداز بیان ہو سکتے ہیں۔ غیر مناسب اور بات کو بگاڑنے والا انداز بیان اختیار کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ خیال رکھیے کہ نہ آپ کی زبان خراب ہو اور نہ اردو زبان بگڑنے پائے۔

○ روزمرہ اور محاورے کی طرح جملے میں فعل کو بھی صحیح صورت میں آنا چاہیے۔ کوئی صاحب کہیں کہ ”یہاں برسوں بہت بڑا جملہ

۴۴
انشا اور تلفظ
وغیرہ کا اضافہ ہو) تب انھیں فعل مستقبل کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔
مثلاً: گھنٹا بھر بعد جلسہ ہونے والا ہو، تو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ جلسہ ہونے
جار ہے۔
ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن یہاں گنجائش
نہیں۔ بس یہ بات ذہن میں بٹھانا ہے کہ جب ہم کچھ لکھیں، یا کچھ کہیں،
تو یہ ضرور دیکھ لیں کہ اس میں کوئی غلطی، کسی طرح کی خرابی یا برائی تو نہیں۔
احتیاط کی عادت پڑ جائے تو پھر ذہن بھی اپنا کام کرتا رہتا ہے اور
نظر بھی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔

۴۵
انشا اور تلفظ
ہونے جارہا ہے، تو اس پر ٹوک دینا چاہیے۔ یہ کہا جاسکتا تھا کہ پرسوں
یہاں بہت بڑا جلسہ ہوگا۔ یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ پرسوں یہاں بہت بڑا
جلسہ ہونے والا ہے۔ ”ہونے جارہا ہے“ تو نرا انگریزی کا ترجمہ ہے
ایسا ترجمہ جو اردو زبان کے مزاج اور اس زبان کے انداز بیان سے میل
نہیں کھاتا۔
ذرا دیر کے لیے مان لیجیے کہ آپ کا نام محمود ہے۔ آپ سے کہا گیا کہ بازار
سے سودا لے آئیے۔ آپ چل دیے یا چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس صورت
میں انگریز کہہ جائے کہ محمود سودا لینے بازار جارہے ہیں، تو یہ جملہ بالکل
درست ہوگا۔ یوں درست ہوگا کہ آپ واقعی بازار جارہے ہیں۔
جارہا ہے، کر رہا ہے، لکھ رہا ہے، ہو رہا ہے (وغیرہ) فعل حال کی
یہ سب صورتیں کام کے جاری ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر
کسی علاقے میں ایک اسکول بنائے جانے کا پروگرام ہے، اس کے لیے
یہ کہا جائے کہ ”اسکول بننے جارہا ہے“، تو یہ صحیح انداز بیان نہیں ہوگا۔
یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ایک اسکول بنے گا، یہاں ایک اسکول بنایا جائے گا
(وغیرہ)۔ مختصر یہ کہ ”ہونے جارہا ہے“ جیسے ٹکڑوں کے استعمال میں
احتیاط کی ضرورت ہے۔
اس سلسلے میں تھوڑی سی وضاحت غیر مناسب نہ ہوگی۔ جارہا ہے
کر رہا ہے (وغیرہ) فعل حال کی شکلیں ہیں۔ ان کے استعمال میں
عام طور پر غلطی نہیں ہوتی۔ ان شکلوں کو عام طور پر زمانہ حال کے
لیے اور خاص صورتوں میں زمانہ مستقبل کے لیے بھی استعمال
کرتے ہیں، جیسے: میں پرسوں دہلی جارہا ہوں (یعنی جاؤں گا)۔ گڑ
بڑا اس وقت ہوتی ہے جب ان سے پہلے کوئی اور ٹکڑا بھی ہوتا ہے،
جیسے: کرنے جارہا ہوں، لانے جارہا ہے، لکھنے جارہا ہے،
ہونے جارہا ہے۔ (وغیرہ) ایسی صورتوں میں، یعنی جب فعل حال
سے پہلے مصدر محرف صورت میں آئے (یعنی: لانے، کرنے، ہونے

انشا اور تلفظ

تلفظ

املا اور انشاء دونوں کا تعلق کھنے سے ہے۔ یہ ٹھیک ہے، مگر جو کچھ کھا گیا ہے، اُسے پڑھا بھی جائے گا، یوں تلفظ بھی اس عمل کا ضروری حصہ بن جاتا ہے۔ جس طرح غلط املا پر اعتراض کیا جائے گا، اُسی طرح غلط تلفظ پر بھی ٹوکا جائے گا۔ لفظوں کا صحیح تلفظ نہ معلوم ہوتا بار بار شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ سبق پڑھنے یا پڑھانے کے دوران کسی لفظ کو صحیح طور پر نہیں پڑھا، تو دہرے میں سب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ کوئی مضمون پڑھ کر سنا یا اور کسی ایک لفظ کا تلفظ بھی غلط ہو گیا تو بڑی رسوائی ہوگی۔ یہ اُمید کی جاتی ہے کہ اچھے طالب علم لفظوں کو صحیح طور پر ادا کریں گے۔ ہم اپنے صحیح نکتہ ہوئے کو غلط کر کے پڑھیں، یہ کوئی اچھی بات نہیں۔

مثال کے طور پر ایک لفظ ”گذشتہ“ کو لیجیے۔ اسے ”گزشتہ“ لکھا گیا تو یہ املا کی غلطی ہوگی۔ لکھا تو صحیح طور پر ”گذشتہ“ (ذال کے ساتھ) لیکن جب پڑھنے کھڑے ہوئے تو ”گذشتہ“ پڑھا (ذال کے نیچے زبر)۔ یہاں لکھا وٹ صحیح رہی، تلفظ غلط ہو گیا۔ اس لفظ کا صحیح تلفظ ”گذشتہ“ ہے۔ (گ کاف پر پیش، ذال پر زبر)۔ کاغذ پر لفظ صحیح طور پر لکھا ہوا ہے، مگر وہ کاغذ تو آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے، سننے والے تو آپ کی زبان سے غلط تلفظ سن رہے ہیں۔

۴۸

انشا اور تلفظ

لفظ کا صحیح املا معلوم ہو، یہ ضروری ہے۔ یہ بھی اُسی قدر ضروری ہے کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ بھی معلوم ہو۔ سبق پڑھتے ہوئے اگر ”توجہ“ کہا گیا تو ٹوکا جائے گا۔ کہا جائے گا کہ ”توجہ“ کہنا چاہیے۔ علما، اُذبا، طلبہ سمجھا جائے، تب بھی ٹوکا جائے گا۔ یوں کہ ان کا صحیح تلفظ علما، اُذبا، اور طلبہ ہے۔

زیادہ مشکل اُن لفظوں میں پیش آتی ہے جن میں تلفظ کی تبدیلی سے معنی بدل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ ”مجاز“ کو لیجیے۔ اسے ”محجاز“ (میم کے ذریعے کے ساتھ) پڑھا جائے تو یہ حقیقت کا متضاد ہوگا۔ اقبال کے اس شعر میں یہ لفظ اُسی معنی میں آیا ہے:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آلباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اب اس جملے کو دیکھیے: ”ہم نے اُن کو محجاز کر دیا ہے کہ وہ ہماری طرف سے یہ کام کریں گے“۔ اس جملے میں بھی ”مجاز“ آیا ہے، مگر یہاں یہ دوسرے لفظ کے طور پر آیا ہے۔ اس کا تلفظ ”محجاز“ (میم کے پیش کے ساتھ) ہے۔ اس کے معنی ہیں: اجازت رکھنے والا، جس کو اجازت دی گئی ہو۔ اگر اس جملے میں ”مجاز“ پڑھا جائے گا تو مفہوم خبط ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہوگا کہ ”مجاز“ اور ”محجاز“ دو الگ الگ لفظ ہیں۔ املا ایک ہے، تلفظ مختلف ہے اور اسی نسبت سے معنی بھی الگ الگ ہیں۔

”شہید“ کی جمع ”شہداء“ ہے (شین پر پیش، ق پر زبر)۔ جیسے شہداء کربلا۔ ایک اور لفظ ہے ”شہدا“ (شین پر پیش، ق ساکن)۔ یہ آوارہ، بدکردار جیسے مفہوم میں آتا ہے (پہلے اس کے کچھ اور معنی تھے)۔ اگر ”شہدا“ کو ”شہداء“ سمجھا جائے تو مفہوم پر کیا گزر جائے گی؟

”فاضل“ کی جمع ”فضلا“ ہے (ف پر پیش، ض پر زبر)۔ ایک اور لفظ ہے ”فضلہ“ (جیسے: سارا فضلہ خارج ہو گیا)۔ املا مختلف ہے، تلفظ ایک ہے۔ ”فضلا“ کو اگر ”فضلا“ پڑھا جائے گا تو پھر یہ لفظ تلفظ

۵۰ میں آکر ”فضلہ“ بن جائے گا۔ آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ یہ کچھ اچھی بات نہیں ہوگی۔

ہم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ صحیح تلفظ مرض ہے یا مرض، حلق ہے یا حلق، عرق ہے یا عرق، عطر ہے کہ عطر، ورق ہے کہ ورق (دو غیرہ)۔ جب ہم مرض، ورق، عرق، حلق، عطر کہیں گے، تب سمجھا جائے گا کہ ہمیں ان لفظوں کا تلفظ معلوم ہے۔

ایک لفظ ہے ”شادی مرگ“۔ اصل میں ”مرگ شادی“ تھا۔ اضافت منقولہ نے اسے ”شادی مرگ“ بنا دیا۔ اسے ”شادی مرگ“ کہا جائے تو تلفظ غلط ہو جائے گا۔ یا جیسے ”پس منظر“ کو ”پس منظر“ کہا جائے، تب بھی یہی کہا جائے گا کہ تلفظ غلط ہو گیا۔ یا جیسے ”سرورقی“ اور ”سرورق“، دو مختلف لفظ ہیں۔ دونوں کے معنی الگ الگ ہیں۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ اس کتاب کا سرورق خوب صورت ہے، تو مفہوم بگڑ جائے گا۔ یہاں ”سرورق“ کہنا چاہیے تھا (اضافت کے بغیر)۔ ان لفظوں کو یہاں محض بطور مثال لکھا گیا ہے۔ ان کی مفصل بحث اسی کتاب کے دوسرے حصے میں ”اضافت کا زیر“ کے عنوان کے تحت ملے گی۔

مرزا غالب کا مشہور شعر ہے :

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ

بہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

”تیز رو“، ”رے پر زبر“ کے معنی ہیں : تیز چلنے والا۔ فارسی کا ایک مصدر ہے ”رفتن“، اس کے معنی ہیں : چلنا، رفتار، اسی سے بنا ہے۔ اسی سے ”رو“، بنا ہے اور اسی ”رو“ سے ”تیز رو“ بنا ہے۔

فارسی میں ایک اور مصدر ہے ”روئیدن“، اس کے معنی ہیں : اگنا۔

”روئیدگی“، اسی سے بنا ہے۔ اس مصدر سے فعل امر ”رو“، بنتا ہے۔

اس سے ایک اسم فاعل ”خود رو“، بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں : اپنے آپ آگ آنے والا۔

لالہ خود رو نہیں ہے، خون نے فر باد کے جوش میں آکر لگا دی کوہ کے دامن میں آگ

”لالہ“ مشہور پھول ہے سرخ رنگ کا۔ اس کا اصلی وطن ایران ہے، جہاں یہ پہاڑوں کے دامن میں کھلتا ہے۔ بے شمار پھول ہوتے ہیں۔ دوسرے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کے دامن میں آگ لگی ہوئی ہے، دیکھتے ہوئے انگارے بکھرے ہوئے ہیں۔ ”لالہ خود رو“، کے معنی ہیں :

اپنے آپ آگ آنے والا لالہ۔ اسے اگر ”لالہ خود رو“، پڑھا جائے تو اس کے معنی ہوں گے : اپنے آپ چلنے والا لالہ۔ مطلب چوٹ ہو گیا نا!۔ تیز رو : تیز چلنے والا۔ خود رو : اپنے آپ آگ آنے والا۔ یہ معنوی فرق معلوم ہو تو ظاہر ہے کہ ”رو“، کا تلفظ غلط ہو سکتا ہے۔ تلفظ غلط ہوا تو معنی بدل جائیں گے، بل کہ یہ کہیے کہ بگڑ جائیں گے۔

فراق گورکھ پوری نے ایک نظم لکھی ہے جس میں پچپن کا ذکر کیا ہے کہ بچہ کس چیز کو کیا سمجھتا ہے۔ اسی نظم کا ایک ٹکڑا ہے :

سمجھ سکے کوئی اے کاش عہد طفلی کو

نمود لالہ خود رو میں دیکھنا جدت

کرے نظارہ کوئین اک گھر وندے میں

اس میں بھی ”لالہ خود رو“، (رے کے پیش کے ساتھ) ہے۔

میر تقی میر کا مشہور شعر ہے :

دلی کے نہ تھے کوچے، اور اقی مصور تھے

جوش شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی

ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ”مصور“، اور ”مصور“، دو مختلف لفظ ہیں۔

”مصور“، کے معنی ہیں : تصویر بنانے والا۔ یہ عربی کا اسم فاعل ہے۔

”مصور“، (واو کے زبر کے ساتھ) اسم مفعول ہے۔ معنی ہیں : وہ تصویر

جسے بنایا گیا ہے ”اور اقی مصور“، کا مطلب ہے ایسے ورق جن پر تصویریں

بنی ہوئی ہیں۔ (مُرتَّع، ایسے ہی اوراق کے مجموعے کو کہتے ہیں)۔ شاعر نے دلی کے گلی کوچوں کو، اوراقِ مصوّر، کہا ہے اور اُن دلوں کو یاد کیا ہے جب دلی کی ہر گلی خوب صورت چہروں سے معمور تھی۔

فیض احمد فیض کی ایک مشہور نظم کا عنوان ہے: ”آج بانار میں پابہ جولاں چلو“
نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:

چشمِ غم، جانِ شوریدہ کا فی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کا فی نہیں
آج بانار میں پابہ جولاں چلو

”جولاں“ (جیم پر پیش) کے معنی ہیں: بیڑی۔ ”پابہ جولاں“ کے معنی ہوئے:
جس کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔

ایک اور لفظ ہے ”جولانی طبع“، بنا ہے جس کے معنی ہیں: طبیعت کی روانی، اُمتنگ۔ ”جولاں“ کے لفظی معنی ہیں: گھوڑا دوڑانا، کڈلانا۔

مطلب یہ ہوا کہ ”جولاں“ اور ”جولاں“، دو مختلف لفظ ہیں۔ فیض کی اس نظم میں ”پابہ جولاں“ (جیم کے پیش کے ساتھ) آیا ہے۔ اسے اگر جیم کے زبر کے ساتھ ”پابہ جولاں“ پڑھا جائے، تو مطلب بدل جائے گا۔ بدل کیا جائے گا، بگڑ جائے گا۔

مرزا غالب کا مشہور شعر ہے:

چاکِ مت کر جیب بے ایام گل
نچھ اُدھر کا بھی اشا را چاہیے

پہلے مصرعے میں ایک لفظ ”جیب“ آیا ہے۔ اس کی دہرائی ہے: جیب، جیب۔ ”جیب“ کے معنی ہیں: پاکٹ، مثلاً: فیض کی جیب میں روپے ہیں۔ ”جیب“ کے معنی ہیں: گریبان، جسے شاعروں کی روایت کے مطابق عاشقِ جوش میں اگر چاک کر دیا کرتا تھا۔ غالب کے اس شعر میں ”جیب“

ہے۔ اسے ”جیب“ پڑھا جائے، یعنی: چاک۔ مت کر جیب بے ایام گل۔ تو شعر کے معنی چوہٹ ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ سننے والے بھی رائے قائم کریں گے کہ اس شخص کو اس لفظ کا نہ تلفظ معلوم ہے اور نہ یہ اس کے معنی جانتا ہے۔ یہ کچھ اچھی بات تو نہیں ہوگی!! ایک ضروری وضاحت۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے:

چاہیے اچھوں کو، جنتِ چاہیے
یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے

اس میں ”چاہیے“ ردیف ہے اور ”جنت“ اور ”کیا“، قافیے ہیں۔ ان دونوں کے آخر میں الف ہے۔ اس لیے قاعدے کے مطابق اس غزل کے سب قافیوں کے آخر میں الف لکھا جائے گا۔ یعنی جن لفظوں کے آخر میں ہائے منتہی ہوگی اُن میں فانی جگہ الف لکھا جائے گا۔ اصل لفظ ”اشارہ“ ہے، اسی طرح نکھنا چاہیے، یہاں چوں کہ یہ ”جنت“ کے قافیے میں آیا ہے، اس لیے اس غزل میں اسے ”اشارا“ لکھا جائے گا۔

تلفظ کے بیان کو اب ختم کیا جاتا ہے۔ نکھنے کو تو بہت کچھ ہے، مگر بات گنجائش کی ہے۔ اصل مقصد یہ تھا بھی نہیں کہ بہت سی مثالیں جمع کی جائیں۔ اصل مقصد یہ تھا کہ اس طرف متوجہ کیا جائے کہ لفظوں کے املا کے ساتھ ساتھ اُن کا صحیح تلفظ بھی معلوم ہونا چاہیے۔ لغت دیکھنے کی عادت ڈالنا چاہیے اور جاننے والوں سے پوچھنے بھی رہنا چاہیے۔

الفاظ کا املا

اس معنی میں ایسے لفظوں کو شامل کیا گیا ہے جن کے اطلاق کے متعلق طالب علموں کے دل میں کسی طرح کا شک پیدا ہو سکتا ہے، یعنی یہ کہ ان کو کیسے لکھا جائے بعض لفظوں کے سامنے ان کے معنی بھی لکھ دیے گئے ہیں۔ اور جو لفظ دو طرح لکھے جاسکتے ہیں، ان کی دونوں شکلوں کو ایک جگہ لکھ دیا گیا ہے۔

آباد آب کی جمع، باپ دادا	آریا	آوا (ہوا)	آٹا (جس نے کسی پیشے والے کا ہنر سیکھا ہو، خاندانی پیشہ ور نہ ہو جس نے کوئی ہنر یا فن باقاعدہ نہ سیکھا ہو)	آٹا (جس نے کسی پیشے والے کا ہنر سیکھا ہو، خاندانی پیشہ ور نہ ہو جس نے کوئی ہنر یا فن باقاعدہ نہ سیکھا ہو)
آباد و جلد و باپ دادا	آز (نام)	آوارہ (شہرت)	آوازہ (شہرت)	آوازہ (شہرت)
آبادی (خاندانی، موروثی)	آزمائش	آزمینہ (کان کا زینور)	آزمینہ (کان کا زینور)	آزمینہ (کان کا زینور)
آبگینہ	آزمائشی	آہا۔ آہ	آہا۔ آہ	آہا۔ آہ
آبلہ	آزوقہ (مختصر سی فنی)	آپن (تالون۔ رسمہ)	آپن (تالون۔ رسمہ)	آپن (تالون۔ رسمہ)
آبنائے	آبائش	آباج، طرز و روش	آباج، طرز و روش	آباج، طرز و روش
آب و دانہ	آسیا (پکلی)	آئیے (آئیے)	آئیے (آئیے)	آئیے (آئیے)
آب و دانے کی بات	آسیہ (فرعون کی بی بی کا نام)	آئینہ	آئینہ	آئینہ
آپ ہی آپ۔ آپنی آپ	آشکارا (ظاہر)	آیت (آیت)	آیت (آیت)	آیت (آیت)
آغ (گہکار)	آگرہ	آیے (آیے کی جمع)	آیے (آیے کی جمع)	آیے (آیے کی جمع)
آخا۔ آخا	آلائش	آیت	آیت	آیت
آخیر (وہ گھاس جو گھوڑوں کے کھانے سے بچ رہتی ہے اور نکال کر پھیلا دی جاتی ہے۔ نکلا، خراب، بے کار)	آلہ (جمع: آلات)	آبیزال	آبیزال	آبیزال
آخوند (استاد)	آملہ	آبرہ (دھبہ پرست)	آبرہ (دھبہ پرست)	آبرہ (دھبہ پرست)
آذر (آگ)	آموختہ (پڑھا ہوا)	آبرو (ایک صحابی کا نام)	آبرو (ایک صحابی کا نام)	آبرو (ایک صحابی کا نام)
آذر بایجان	آلو، آلوؤں	آبر (ابر۔ کمال)	آبر (ابر۔ کمال)	آبر (ابر۔ کمال)
آزائش	آلو	آپا	آپا	آپا
آزائشی	آلشتی پاشتی	آپا پتا	آپا پتا	آپا پتا
آرٹیکل	آٹو	آپا	آپا	آپا
	آئینہ۔ آئینہ	آپا چڑھاو	آپا چڑھاو	آپا چڑھاو

آجیان	آرتیس	آریفیل	آلبیہ
آقاہ	آرتھتیا	آلس (ایک ریشمی پیرا)	آلس
آداب (ادب کی جمع)	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آدب (دعا کی جمع)	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آدلا (ٹانگ کا بے ریشہ)	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آگوشٹ	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آدلا بدلا	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آدنا	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آدوان، ادوائن	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آدویہ (دوا کی جمع)	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آدھن	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آدھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آدھیل	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈیٹر	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈین	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈیشن	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈیشنل	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈعان (یقین کرنا)	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈفر	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈکار (ذکر کی جمع)	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈیت	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈبٹ (میل جول)	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈتھال (مرجانا)	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈٹ (ترک)	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈڈل (بہت ذلیل)	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈخوان (سرخ رنگ)	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈرخ پھول	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈگیا	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈنی	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا
آڈنالیس	آرتھتیا	آرتھتیا	آرتھتیا

Scanned by CamScanner

[illegible]

[illegible]

شدا	سہا ایک - سہا ایک	سینچولا
شدرمگین	سینچو	سینچولیا
شخصت (سطح)	سہا، یہے، سہیں	سینیرا
شطرنج	سینچو	سینتر
شکارا	سینات	سینخائی
شکرانہ	سینارہ	سینچنا
شکرانا (سادہ چاولوں)	سینارہ	سینچنا
شکر اور گھی ملا ہوا)	سیدھا سدا	سندلیسا
شکرہ	سپا (ایک دھات)	سنگالی، سینکنا،
شکر پارا	سیکڑا، سیکڑ	سیکوانا، سیککنا
شکر خورا	سیکڑوں	سیکک -
شکر گزار	سینتا پس	سینہ
شکر یہ - شکرے	سینتیس	سوا، سوئی، سوئیان
شلاؤکا	سینٹھا	سوارت
شلپتا (ٹاٹ کا بڑا)	سیندور	سواے
شقیلا	سینیر	سوتا (صوت)
شمبھو		سوچنا
شمس (فتح)	شاخسار	سور
شمس الہدا	شاخسانہ	سولہ، سولھوں،
شوالا	شاذ	سولھوں،
شورا (جلس شول)	شاستری سنگیت	سولھوں
شوربا	شالا (پاٹھ شالا)	سویاں
شورہ پوشت	شامیانہ	سودی تیر
شہدا (شہید کی جمع)	شاربہ	سوؤ (میرا)
شہندا	شاید	سوؤ اتفاق
شہرہ	شابتہ - شایسنگی	سوؤ ادب
شے	شانگان	سوؤ ظن
شیخی خورا	شعب خون	سوؤ ہضم
شہرہ	شہرہ - شہرہ	سویمبر
شیک پیر	شفتا	سم (دھنکا فعل)
شیوا (شیوا بیان)	شیخوئے (کو تو ال)	سہلے (لام سہلے)

سَدھ بَدھ	سائے کا ٹیٹھ
سَدھ	سائٹھنا
سَدھ (ایک پھل)	سائچا
سَدھ	سائچھ
سَدھ	سائیتھ
سَدھ	سارڈ
سَدھ	سائکل
سَدھ	سایا (ایک پوشاک)
سَدھ	سایمان
سَدھ	سایے، سایوں
سَدھ	سببا (ملکہ بلقیس کے
سَدھ	پاے تخت کا نام)
سَدھ	سبجو (شیخ)
سَدھ	سبج دسات)
سَدھ	سبھاو
سَدھ	ستارہ
سَدھ	ستاپس
سَدھ	ستایش
سَدھ	ستایشی
سَدھ	ستترہ
سَدھ	ستروان - ستروہیں
سَدھ	ستروہوں
سَدھ	ستوان
سَدھ	ستوانا
سَدھ	ستھرو
سَدھ	ستیتھیت
سَدھ	ستیتھ کام
سَدھ	ستیتھ گرو
سَدھ	ستٹا
سَدھ	سحاب (بادل)
سَدھ	سَدھ

زرتشت	رواٹسا	رحمت اللعالمین	۴۲
زردا	روپیہ - روپے	رخصتانہ	
زکات	روزنامچہ	رخنہ	
زکریا	روزینہ	ردا	
زال	روضہ	ردالا	
زتا ر	روکھا	ردالت	
زنانا (زنخا)	زکھائی	ردیل	
زنانہ مکان	زوتا	رزیمہ	
زنجیرہ	رومال	رزویشن	
زنخا	رومالی روٹی	رزینٹ	
زہر (حضرت فاطمہ کا لقب)	رومالی سونیاں	رزینسی	
زہر آب	رؤمت الکبرا	رستہ	
زہر جہرہ	رونگٹا	رسوئی	
زہرہ (ایک ستارہ)	روداد - رویداو	رسوئیا	
زہرہ (پتلا)	رویہ	رضاعت (بچوں کو دودھ پلانا)	
زہرہ (پتلا)	رویش	رضاعی بخائی دودھ	
زہرہ (پتلا)	ریشہ	شریب بخائی	
زہرہ	ریشہ نگاری	رضوان	
	ریشہ	رطب و یابس	
ژالہ (اولا)		رعایتی	
ژرف (گہرا)	زاویہ	رفت و گذشت	
ژولیدہ (آجھا ہوا)	زاٹچہ	رتقہ	
پریشان	زاسر	رکاد	
	زہر جہ	رکشا	
	زہور	رُحالی (بابائے کی)	
سایودانہ	زبون	رہنا (چراغ گاہ)	
سائن (کپڑا)	زطل	رند سلا	
سادھوس دھوؤں	زطلی	رندوا	
سال گرہ	زجر	رواں - رواں	
سال نامہ	زچہ	روئیں دار	
سانپ	زخار (بہر زخا)		
سانمہ			

